UNIVERSAL LIBRARY

مجلۂ عثمانیہ

(جلد ۱۶ شمارہ ۲)

طلباء جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو

محمد علی نیر ایم۔اے (آخری)

نائب مدیر

رحیم الدین کمال بی۔اے (آخری)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن۔

مجلس انتظامی

۱۳۵۲ف

(صدر)

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب ایم۔اے ایل۔ایل۔بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ

(مشیر حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ انگریزی)

مسٹر ایم۔ ایس۔ ڈی سے سوامی بی۔اے (آکسن) ایم۔اے۔ ایل۔ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمٰن صاحب بی۔ایس سی۔ پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد مجلس مشاورت)

مولوی سید محمد یونس صاحب وفاقانی بی۔اے (عثمانیہ) ایم۔ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ایم۔آئی۔آر۔ای (لندن)

(معتمد اعزازی مجلس انتظامی)

محمد علی نیّر ایم۔اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

(اراکین)

مسٹر کے آر۔ ریڈی ایم۔اے (آخری) مدیر حصۂ انگریزی

رحیم الدین صاحب کمال بی۔اے (آخری) نائب مدیر حصۂ اردو

سعید احمد صاحب مینائی ایم۔اے (ابتدائی) نائب مدیر حصۂ انگریزی

مجلس مشاورت

(صدر)

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (کینٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ انگریزی)

مسٹر ایم ایس درے سوامی بی۔ اے (آکسن) ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد اعزازی)

مولوی سید محمد یونس صاحب وفا قانی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ ایم۔ آئی۔ آر۔ ای (لندن)

اطلاع

(۱) تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔
(۲) خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
(۳) چندہ کی تمام رقمیں خازنِ اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

چندہ

(۱) موجودہ طلبہ جامعہ عثمانیہ سے .... للعہ ر
(۲) طلباء قدیم و اساتذہ جامعہ عثمانیہ سے .... صہ ر
(۳) عام خریداروں سے .... لے ر
(۴) فی شمارہ .... عاں

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے اور بصورت منی آرڈر اخراجاتِ ڈاک میں کمی ہوگی۔
۱ - بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کلدار - ۱۲ر سکہ عثمانیہ
۲ - بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کے وی پی کے اخراجات ۴ر کلدار، ۶ر سکہ عثمانیہ
۳ - بذریعہ بک پوسٹ ۹ آنے کلدار، ۶ آنے سکہ عثمانیہ۔

ارشادات ہمایونی

حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی

مشورۂ نیک برائے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی

درخیالِ ما برائے اینہا دورانِ حصولِ تعلیم حصہ در اُمورِ سیاسی مُلک گرفتن (یعنے در پالٹیکس) مُفید نہ باشد کہ ہرچہ نتائج آن در مُماثلِ مُقدمات خواہ اندرون ملک باشد یا بیرون بہ وقوع آمدہ اند وآن ہم از چشم ایشان پوشیدہ نیست بلکہ عالم آشکارا نظر برآن این ہا را لازم کہ قبلِ اختیار کردن اَمرے بر مالہٗ وما علیہ آن نظرِ غائر بہ دارند تا کہ پشیمانیٔ غلط اقدام دامنگیر ایشان نہ شود!! آرے این ممکن است کہ بعد حصول تعلیم اگر این ہا خود را قابل ثابت کردہ در اُمورِ متذکرۂ صدر شرکت بہ کنند وآن ہم با حزم و احتیاط و ہم با فراست و دانشمندی کہ شیوۂ ہمہ عُقلاء و مُدبرینِ جہان است (یعنے ہلتھی پالٹیکس) مُضایقہ نہ باشد بشرطیکہ ہر شئے اندرون حُدودِ مُعیّنہ باشد و ہم اختیار کردہ بعد غور وخوضِ بسیار کہ واقعیٔ رہ نوردی در این کوچۂ پُرخار آسان نیست بلکہ خیلے دشوار و ہم ایشان باید دانست کہ بغیر آمدِ بہار صبا در چمن جلوۂ خرامی نہ نماید و ہم بہ طرفِ دیگر گلہائے نوع بہ نوع تبدیلِ لباس نہ کنند تا وقتیکہ لوازمۂ بساطِ گلزار بہ احسن الوجوہ مہیا نہ باشد ورنہ کسے خواہشمند نظارہ منظرِ خوش نخواہد شد واین ہمہ اسباب از "فیضانِ قدرت" پیدا می شوند تا کہ آبیاری وشادابیٔ چمن مفقود نہ شود بلکہ بر جائے خود بر پایہ استوار باقی ماند۔

طبع شدہ

در اخبار صبح دکن ششم ماہ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ ہجری

کلیہ مسلّمہ دُنیا

آنان کہ در دماغ خود مادۂ تکبر و نخوت می دارند یا جلب منفعت پیش نظر ایشان باشد یا خود را عادی زندگی عیش و عشرت ساختہ اند یا قلوب ایشان از خدمت بنی نوع انسان خالیست یا از جوہر ہمدردی و اعانت محروم۔ ہرگز در مقاصد خود کامیاب نمی شوند یا خود را برائے خدمت خلق اللہ اہل ثابت نمی کنند و اصل سبب ناکامی این امور فقدان استقامت مذہب و ہم عقائد باشد و ہم قصور ہمت و جرأت در تکمیل امور دینوی کہ حق و صداقت چہ چیز ہست ازان یک لخت آنہا ناآشنا کہ نتیجہ اش بجز این چیزے دیگر نیست کہ در راہ ظلمت منزل مقصود را تلاش کناں سرگردان می باشند ازین سبب گفتہ اندکہ "آب حیوان" را بدست آوردن آسان نیست۔ بجز رہنمائی خضرؑ یا این آن دُرِ شہوار است کہ در قعر دریا بہ بطن صدف نشستہ است و تا وقتیکہ غواص جوہر شناس دری نہ نماید آن درکفش نمی آید کہ بغیر زحمت نوالہ ہم در دہان نمی رسد۔

خلاصہ اینکہ انسان را باید کہ حتی الامکان اوصاف برگزیدہ در خود پیدا کردہ دعوی نشستن در صف صاحبان ضمیر و کردار بہ کند و رنہ بغیر این شرط دعوی او بلا تدلیل ہیچ وقعت نزد منصف مزاجان یا عقلائے جہان نمی دارد۔

بہ بہ چہ کلیۂ زرین است !!

طبع شدہ در اخبار نظام گزٹ یازدہم ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۱ ہجری

مسئلہ علم و فضل

لاریب کہ این شیئے گران بہاست و صرف در حصۂ آن ہا (بہ حصہ رسدی) می آید کہ فطرتاً برائے این "عطیۂ قدرت" مخلوق گشتہ اند و بہ طرف دیگر تکمیل ہمہ امورِ دینی باشند یا دنیوی برآن منحصر ازین سبب گفتہ اند کہ انسان بغیرِ علم و فضل و ادراک ما فیہا از صفتِ انسانی متصف نمی شود (در صحیح مفہوم) و ہم خدا و رسول ﷺ را نمی شناسد و آنچہ فرائض کہ بر دوشِ او عائد اند پا بجائی ایشان از و ناممکن تا وقتیکہ شعور نزاکتِ آن ہا بہ ذاتِ خود نمی دارد۔

خلاصہ اینکہ این آن شیئے کمیاب ہست کہ در حصولِ آن تگ و دو بسیار گردنیست تا آنکہ او در دامنِ مراد بہ افتد۔ دیگر از علم و فضل منصب یا منزلت انسان شناخت کردہ شود کہ او چہ پایہ درمیان ابنائے جنس یا بنی نوع انسان می دارد۔ الحاصل ضرورتِ علم و فضل در این دنیا از حد ضروریست خصوصاً می بینیم کہ حالات عالم را چہ تغیر دامن گیر شدہ است و ہم بہ چہ رنگ واقعات گیتی قلا بازیان می خورند کہ در این سیلاب صرف اقدام آن گروہ بر جادۂ استقامت می مانند کہ دل و دماغ ایشان از ضیائے علم و فضل منور ہست و ہم آن ہا مادۂ غور و فکر یا بالغ نظری در فن رائے زنی بر امورِ متنوعہ می دارند ورنہ ممکن نیست کہ از گرداب انتشار ایشان رہائی یابند کہ طوفانِ باد و باران بہ شدّ و مد نمودار شدہ است کہ کشتی بانی بہ پیشِ این موانعات خیلے دشوار می نماید لہذا ضرورت است کہ بہ عقل و تدبیر کار کردہ زورق را بہ ساحل سلامتی بہ رساند و این خدمتِ مدبرین یا عقلائے جہان است۔

طبع شدہ در اخبار صبح دکن چہاردہم ذی قعدہ ۱۳۶۰ھ

فہرست مندرجات مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۶) شمارہ (۲)

(ادبی تحقیقات)

(علمی تنقیدات)

(سوانح حیات)

(لطائف و رومان)

(افسانے)

(قطعات و رباعی)



محمد علی نیر ایم-اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو مجلۂ عثمانیہ
سابق صدر بزم اردو جامعۂ عثمانیہ

اداریہ

حرفِ اوّلین

مجلہ عثمانیہ کی سولھویں جلد کا دوسرا شمارہ طمانیت کے احساس کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے چند اساسی حقائق کے اظہار کی اجازت دیجئے گا۔ مجلہ کا بنیادی مقصد معیارات پیش کرنا ہے ــــــ علمی و ادبی معیارات، تنقیدی و تحقیقی معیارات، شعری و افسانوی معیارات ــــــ اگر زیرِ نظر اشاعت کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ آپ اس کے مندرجات کے میلانات کو مجلہ کی نصب العینی غایت کے ساتھ ہم کنار پائیں گے۔

جامعہ میں اس وقت متعلمین کی تعداد بارہ سو سے متجاوز ہے۔ اس عظیم ترجماعت کی ذہنی و فکری صلاحیتوں اور تنقیدی بصیرتوں سے کون انکار کی جرأت کرسکتا ہے؟ یہ گروہ حیدرآباد کی نشاۃِ ثانیہ کا پیغام بر اور تہذیبی و ثقافتی تحریکات کا علم بردار ہے۔ اس کے ہاتھ میں حیاتِ نو کی مشعل ہے۔ لیکن جامعہ کی وسیع تر علمی فضا کے باوجود ہم نے محسوس کیا ہے کہ مجلہ کے لئے معیاری مضامین فراہم کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ اس امرِ معترضہ سے قطع نظر ہم نے اس اشاعت کو ہر حیثیت سے 'ممتاز' بنانے کی امکانی کوشش کی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری مساعی اور اس پیش کش کا آپ دلی خیر مقدم فرمائیں گے۔

مضامین

حصۂ نثر کا افتتاح محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کے رشحاتِ قلم سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اِس محققانہ مقالہ میں ہمیں عہدِ محمد قلی قطب شاہ سے قبل کے ایک باعظمت اردو شاعر فیروزؔ سے روشناس فرمایا ہے۔ اِس گراں مایہ کارنامہ کی دنیائے تحقیق ہمیشہ ممنون رہے گی۔ ڈاکٹر زورؔ زبان و ادب کے ان چند رفیع الشان محسنوں میں سے ہیں جن کا نام ہر اُس مقام پر عزت او احترام سے لیا جاتا ہے جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ شعرائے اُردو سے متعلق اُردو اور فارسی میں بیسیوں تذکرے لکھے جا چکے ہیں۔ تاہم ہنوز یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اُردو کا پہلا باعظمت سخن طراز کون ہے۔ عرصہ تک ولیؔ اورنگ آبادی کو بابائے ریختہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا، بعد کو محققین ادب نے یہ اعزاز محمد قلی قطب شاہ کو بخشا۔ لیکن اب ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون سے بحث و تنقید کے ایک جدید باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

"جنوبی ہند کی اردو خدمات" جناب خواجہ حمیدالدین صاحب شاہدؔ متعلم ایم۔ اے (آخری) کے اُس اہم مقالہ کا اقتباس ہے جو انھوں نے کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ بنگلور کے ارباب کار کی خواہش پر تیار کیا تھا۔ اس کانفرنس کا افتتاح آنریبل لفٹننٹ کرنل ڈی۔ ایم۔ فریزر رزیڈنٹ میسور کے ہاتھوں عمل میں لایا گیا تھا۔ جناب شاہدؔ نے یہ مقالہ رکن الملک کی صدارت میں پڑھا تھا شرکائے کانفرنس نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ میسور کے مقامی اخبارات میں بھی اس مقالہ کی بیحد ستائش کی گئی تھی۔ اس مقالہ میں جنوبی ہند میں اردو کی نشو و نما اور ارتقاء سے متعلق ٹھوس معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم عدم گنجائش کے سبب پورا مقالہ شائع نہ کرسکے۔

"مرہٹی ادب بیسویں صدی میں" جناب امجد علی خاں صاحب یوسف زئی بی۔ اے (عثمانیہ) کی تحقیقی کاوش کا ثمرہ ہے۔ امجد کو ہندی اور گجراتی زبانوں سے بخوبی واقفیت ہے۔ مرہٹی ادب سے تو انہیں خاص طور پر شغف ہے۔ آج کل یہ بڑی سرگرمی اور خلوص سے

مذکورہ زبانوں کے شاہکاروں کو ہماری زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے بڑی شائستگی کے ساتھ متعلقہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا اندازِ بیان بھی بیحد شگفتہ ہے۔

محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون نے شدید تقاضوں اور مسلسل جدوجہد کے بعد اپنا گراں بہا تنقیدی مقالہ " اجنبی اقوام کو مراعاتِ خصوصی " دو نشستوں میں راقم الحروف کو تحریر کروایا۔ ڈاکٹر صاحب مادر جامعہ کے اُن گرامی قدر فرزندوں میں سے ہیں جن کا وجود عثمانیہ برادری کے لئے متاعِ عزیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے اس مقالہ میں اسلامی قانون کی انفرادیت وہمہ گیری اور مسافر مسلمانوں کے لئے شرعی احکام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ممالکِ غیر میں مسلمانوں کے مراعاتِ خصوصی کے مسئلہ پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ عالمانہ بحث فرمائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ غیر معمولی علمی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی اشاعت پر ہم خود کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں۔

" سوویٹ جمہوریت میں انسانی حقوق " جناب سید عالم صاحب خوندمیری ایم۔اے (عثمانیہ) متعلم ایل ایل۔ بی (ابتدائی) کا مقالہ ہے۔ اس میں انہوں نے اشتراکی معاشرہ کی بنیادی خصوصیات، وسائل دولت کی قومی تنظیم اور سوویٹ جمہوریت و سرمایہ دارانہ جمہوریت کے فرق پر تنقید کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء کے دستور کے بعض اجزا کو واضح کیا ہے۔ مقالہ پوری تیاری کے بعد سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

" روس کا شکسپیر " اور " عرفی پر ایک اجمالی نظر " دو سوانحی مضامین ہیں۔ ان میں علی الترتیب جناب علی احمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ) اور جناب محمد مصلح الدین صاحب صدیقی متعلم بی۔اے (ابتدائی) نے روس اور شیراز کی دو غیر فانی ہستیوں، پشکن اور عرفی کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔

لطائف وظرائف کو پڑھتے وقت غیر ارادی طور پر آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگے گی۔ یہ جناب محمد بن عمر صاحب ایم۔اے (عثمانیہ) لکچرار ادبیات انگریزی جامعۂ عثمانیہ کا

دلچسپ مضمون ہے۔ صاحبِ موصوف مشاہیر کے لطائف جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کردیں تو یہ ادب لطیف کی ایک مفید خدمت ہوگی۔

جناب عبدالمجید خاں صاحب یوسف زئی متعلم بی۔ اے نے "روسو کا ایک رومانی خط" پیش کیا ہے۔ زندگی کا صبر آزما سفر بغیر رومان کی لطافتوں کے بے کیف ہے۔ رومان کہاں نہیں شاعر اور ادیب کی نگاہ تو قدرت کے ہر منظر میں رومان کی تجلی دیکھتی ہے ——— پھولوں کے تبسم میں رومان، ستاروں کے رقص میں رومان، موجوں کے نغموں میں رومان ——— رومان تو کائنات کو محیط کئے ہوئے ہے۔

افسانے

"دو سیکلیں" ——— حیدرآباد کے ایک نوجوان انشا، پرداز جناب افضل عابدی صاحب کا طبع زاد افسانہ ہے۔ اس افسانے کی ٹکنیک پر بظاہر آپ کو مغربی ٹکنیک کا دھوکا ہوگا۔ لیکن دراصل یہ ایک نئی ساخت کا افسانہ ہے۔ عالمگیر تاثر اور وسعت اس افسانے کی خصوصیات ہیں۔ اس افسانے کو پڑھنے کے بعد آپ محسوس فرمائیں گے کہ افسانہ نگار کی طبیعت میں غیر معمولی ذکاوت ہے اور اس کی نگاہ زندگی پر وسیع ہے۔ افسانے کی ابتدا اور اختتام دونوں شاندار ہیں۔ ان میں فنی حسن ہے۔ اس قسم کے اچھے کارناموں کی داد حال سے زیادہ مستقبل کا مورخ دے گا۔ لطیف طنز کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"رات ڈھل چکی تھی۔ بادلوں کا لشکر تیزی سے کسی ایک طرف بھاگا بھاگا جارہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قریب ہی میں گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ آسمان سے خون برسے گا۔ قانون اور لوہے کے دیوتا اسی خون میں نہا کر اپنے ہزاروں، لاکھوں گناہوں سے بے نیاز ہوجائیں گے۔"

"دور سے موذن کی آواز سنائی دی جس میں عبودیت کے عجز سے زیادہ

تقدس کا زعم ملا ہوا تھا ـــــ اللہ اکبر ـــــ اللہ اکبر ـــــ اللہ اکبر"

"کیلنڈر" جناب محمد عبد القادر صاحب فاروقی کی ذہنی تخلیق ہے۔ فاروقی صاحب جامعہ کے ایک ممتاز فسانہ نگار ہیں۔ اس افسانہ میں انہوں نے ایک غیر شادی شدہ استانی کے قلبی واردات اور نفسی کیفیات کے مرقعے چابک دست مصور کی طرح نفاست کے ساتھ پیش کئے ہیں "کیلنڈر" افسانہ نگار کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتا ہے۔

جناب سید محی الدین احمد صاحب متعلم بی۔ اے (آخری) ایک ہونہار افسانہ نگار ہیں "پہلی کہانی" ان کا ایک ہندی سے ماخوذ افسانہ ہے یہ افسانہ جس قدر مختصر ہے اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔

منظومات

آہنگِ نو

"رنگین خیالات" مولوی فضل الرحمن صاحب بی۔ اے (آنرز) ناظم محکمۂ نشریات لاسلکی کی جدت آفریں نظم ہے۔ یہ پُر کیف نظم لاسلکی نشرگاہ حیدر آباد کے غیر معمولی نشری مشاعرے منعقدہ ۳ امر بہمن ۱۳۵۲ف میں جس کا افتتاح ڈاکٹر والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع کے کلام بلاغت نظام سے کیا گیا تھا، داد و تحسین کے ہجوم میں پڑھی گئی تھی۔ خیال کا متاثر کن پس منظر، واقعات کی شاعرانہ تعبیریں، اسلوب بیان کی جدت، زبان کی شیرینی اور ترکیبوں کی دلکشی اس نظم کی چونکا دینے والی خصوصیات ہیں۔

"دست برداری" جناب علی احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کی نظم ہے۔ موصوف جامعہ عثمانیہ کے ممتاز شعراء میں سے ہیں۔ ان کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ ہے۔ انھوں نے

اُردو ادب کے ساتھ ساتھ مغربی شاعری کا بھی وقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور کئی انگریزی نظموں کو اُردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ یہ نظم بھی انہوں نے ایک انگریزی نظم سے متاثر ہو کر کہی ہے۔

"دکن میں عیدین اور تہوار" ایک مضمون کا عنوان تو ہو سکتا ہے لیکن جناب امیر احمد صاحب خسرو (عثمانیہ) نے اس موضوع پر نہایت لطافت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ شاعر نے تاریخ دکن کے اتحاد آفریں پہلو کی ایک دلکش تصویر پیش کی ہے۔

جناب نور محمد صاحب نور اکیلوی متعلم بی۔ اے ایک خوش فکر ہیں۔ "نوائے شاعر" میں ان کے ذوق کی پاکیزگی نمایاں ہے۔

سوز و ساز

حصۂ غزل کا افتتاح نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی کیف پرور غزل سے کیا جارہا ہے۔ عزیز دبستان داغ کے ممتاز ترین علمبردار ہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی سادگی و پرکاری، وہی زبان و محاورہ کی چاشنی، وہی طرز ادا کی شوخی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جو داغ کا مخصوص رنگ ہے۔ ان کی یہ غزل سالِ نو کے مشاعرے میں جو بزم اُردو جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ۱۵؍ آذر ۱۳۵۳ف کو خود انہیں کی صدارت میں منعقد کیا گیا تھا پڑھی گئی تھی۔

جناب میر حسن صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) سابق صدر انجمن اتحاد و مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ' جامعہ عثمانیہ کے سربرآوردہ مصنفین میں سے ہیں ان کا کلام پہلی مرتبہ مجلہ میں شائع کیا جارہا ہے میر صاحب نے اپنے افکار کی بنیاد عصری میلانات پر رکھی ہے اور روایتی موضوع و آہنگ سے گریز کر کے غزل کی امکانی وسعت کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے اگر اس رنگ کو فروغ دیا جائے تو غزل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو سکتا ہے اور اس کی فضا پھر چمک سکتی ہے۔

جناب وصی احمد صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) کی غزل میں آپ الفاظ کی خوش آہنگی کے ساتھ ایک سرمستی بھی پائیں گے۔

جناب عبدالحفیظ صاحب قتیل ایم۔ اے (عثمانیہ) فانی کے اندازِ فکر سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور راز و نیاز کی تصویریں حسن کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کی غزل جاذب توجہ ہے۔
جناب لطیف شریف صاحب ساجد متعلم سال سوم جامعہ کے ایک نوخیز شاعر ہیں انکی غزل بھی بہت دلچسپ ہے۔

شہزادی برار کی انسانیت پرور اپیل

علیا حضرت شہزادی برار کو ملک کی دفاعی و رفاہی مسائل سماجی و تعلیمی تحریکات اور قومی تعمیری سرگرمیوں سے عمیق ترین دلچسپی ہے۔ ملک کی مختلف انجمنوں اور اور جماعتوں کو ان کی حوصلہ افزا سرپرستی اور رہبری کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ حیدرآبادی خواتین کی شہری دفاعی جماعت اور مرکز خواتین مساعی جنگ نے شہزادی ممدوحہ کی ولولہ خیز قیادت میں دوررس اقدامات کئے ہیں۔

شہزادی موصوفہ کا دل انسانی ہمدردی کے بے پایاں احساسات سے مملو ہے۔ انھوں نے ملک کے غذائی بحران کی نزاکت کو بر وقت محسوس فرماکر بڑے عزم کے ساتھ مصیبت زدوں اور حاجت مندوں کے لئے ایک امدادی مہم کا بھی آغاز فرمایا ہے۔ ان کی اس قابل ستائش مہم میں شخصی دلچسپی نے معاشرہ کے دیگر طبقوں پر بھی نفسیاتی اثر ڈال کر حصولِ مقصد میں بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔

شہزادی محترمہ نے سرمایۂ امداد اغذیہ کے سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ صاحبان اور طلباء سے بھی تعاون واشتراکِ عمل کی بہ نفس نفیس اپیل فرمائی ہے۔ اس خصوص میں عالیجناب نائب معین امیر جامعہ نے اساتذہ اور طلباء کا ایک نمائندہ جلسہ بھی طلب فرمایا تھا۔ اس جلسہ میں اساتذہ میں سے پروفیسر درے سوامی، ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی اور جناب امتیاز حسین خاں صاحب بی کام اور طلباء میں سے جناب سید عابد حسین صاحب رضوی بی۔اے (آخری) صدر بزم معاشیات اور جناب شیخ حیدر صاحب بی۔اے۔ ایل ایل۔بی صدر بزم قانون نے غذائی

صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے شہر کا جلسہ سے ملک کے مستحقین کی مالی امداد کے لئے اپیل کی۔

ہم بھی اِس موقع پر برادرانِ جامعہ سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ملک کے نادار اور غیر مستطیع طبقوں کو گرانی کے مصائب سے نجات دلانے اور انہیں فاقہ کشی کی بھیانک موت سے بچانے کے لئے علیا حضرت شہزادی برار کی اپیل کا خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیں گے۔ بالخصوص ہم جامعہ کے خوش حال طلباء سے متوقع ہیں کہ وہ سنگ دل و بے رحم انسانوں کی طرح "تماشائے اہلِ کرم" نہ دیکھیں گے بلکہ ان سے جو خوش آئند توقعات اور خوشگوار تصورات وابستہ کئے گئے ہیں ان کے مدِ نظر وسیع تر نقطۂ نظر کے ساتھ اپنی معیاری و مثالی کوششیں صرف کرینگے۔

توسیعی تقاریر

جامعہ عثمانیہ اعلحضرت سلطان العلوم کا ایک عہد آفریں کارنامہ ہے اس عظیم الشان علمی و ثقافتی ادارہ کی جانب سے جن وسیع تر بنیادوں پر بلا واسطہ و بالواسطہ اہلِ ملک کی جو خدمت کی جارہی ہے اس کی نظیر حیدرآباد کی گزشتہ ربع صدی کی علمی تاریخ نہیں پیش کرسکتی۔

ہر سال جامعہ کی جانب سے توسیعی تقاریر کا نظام نامہ ترتیب دیا جاتا ہے جو ہمہ گیر موضوعات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس سلسلۂ تقاریر سے اہلِ ملک کی ذہنی و تمدنی زندگی پر دوررس اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

اس سال بھی محترم ڈاکٹر سید حسین صاحب مسجل جامعہ نے ایک معلوماتی نظام نامہ مرتب فرمایا تھا۔ اس کی مطبوعہ کاپی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ موضوعات کی افادیت اور معیار سے ہمیں انکار نہیں، لیکن ہم نے اس میں ایک کمی محسوس کی ہے وہ یہ کہ ان توسیعی تقاریر کے نظام نامہ میں ہمیں زبان و ادب کے مسائل سے متعلق کوئی موضوع نظر نہیں آیا۔ یہ ملک کی کس قدر بد قسمتی ہے اور یہ حقیقت کس درجہ دل خراش ہے کہ مختلف جماعتیں ہماری زبان کے خلاف مخالفانہ محاذ تیار کرنے میں سرگرم کار ہیں اور پینترے بدل بدل کر اس کی گلو تراشی کی کوشش

کر رہی ہیں۔ اُردو کے خلاف ذہنیتوں کو مسموم کرنے والا جو تعصب آمیز پروپگنڈا کیا جارہا ہے اس کے اعادہ کی ہم یہاں ضرورت نہیں سمجھتے۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ اُردو کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں بلکہ بین قومی تعلقات کا ایک خوشگوار اور یادگار حاصل ہے۔ اس کی تشکیل، نشوونما اور توسیع میں ہندؤں اور مسلمانوں نے مساویانہ حصّہ لیا ہے۔

موجودہ زمانے میں اعلیحضرت جلالت الملک اردو زبان کے سب سے بڑے سرپرست ہیں اور جامعہ عثمانیہ اس کی عظیم ترین محافظ ہے۔ اِن حالات میں ہماری رائے میں اگر جامعہ کی توسیعی تقاریر میں زبان و ادب سے متعلق موضوعات بھی شریک کر لئے جائیں تو ہمارے فاضل پروفیسر صاحبان اپنی حیات بخش قوتوں اور واضح تفکر سے ملک کی صحیح رہبری کر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہماری ایک اور تجویز یہ ہے کہ اب تک توسیعی تقاریر کے لئے اساتذہ صاحبان جامعہ عثمانیہ اور بیرونی مشاہیر کی خدمات حاصل کی جاتی رہی ہیں۔ ہماری رائے میں ایسے فارغ التحصیل عثمانئین کو بھی جو اصابتِ فکر کے باعث حیدرآباد کی ادبی وسماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور جن کا تعلق جامعہ کے طبقۂ اساتذہ سے نہیں ہے، توسیعی تقاریر کی دعوت دی جانی چاہئے۔ اس سے ایک طرف فارغین جامعہ کی عزت افزائی ہوگی جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں تو دوسری طرف اربابِ جامعہ اور وابستگانِ جامعہ کے رشتۂ اتحاد و یگانگت اور روایات خلوص و مودت کو تقویت پہنچے گی۔

ہمیں محترم ڈاکٹر سید حسین صاحب سے یقین ہے کہ وہ آئندہ مذکورۂ بالا کمی کی خاطر خواہ تلافی فرمائیں گے اور ہماری دوسری تجویز کو بھی روبہ عمل لائیں گے۔

صحافت کی تعلیم

اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو محترم

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کی ممتاز صدارت میں کلیۂ فنون میں منعقد ہوا تھا، راقم الحروف کی مرتبہ قراردادوں کو شعبۂ اُردو اور دیگر شعبہ جات کے مختلف طلباء نے پیش کر کے ایوان کی منظوری حاصل کی تھی۔ ان قراردادوں میں جامعہ میں شعبۂ صحافت کے قیام سے متعلق بھی حسب ذیل ایک قرارداد منظور کی گئی تھی:۔

"یہ کانفرنس ارباب جامعہ عثمانیہ کی توجہ جامعۂ عثمانیہ میں شعبۂ صحافت کے قیام اور اس کی تعلیم کی جانب مبذول کراتی ہے اور امید کرتی ہے کہ ارباب جامعہ صحافت کی روزافزوں اہمیت کے پیش نظر شعبۂ صحافت کے قیام کی جانب بہت جلد عملی اقدام فرمائیں گے۔"

صحافت، تمدنی زندگی کا ایک اہم ترین شعبہ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اور تعمیری یا تخریبی فضا تیار کرنے والے عوامل میں صحافت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

جامعہ کو زیادہ وسیع اور مثالی بنانے کے لئے حال ہی میں تجارت اور جغرافیہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ نیز بہ صرف کثیر اطلاقی کیمیا کا شعبہ بھی قائم کیا جا چکا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ جامعہ میں اب تک صحافت کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ حیدرآباد کے طلباء کو صحافتی پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستانی جامعات مثلاً علیگڈھ، پنجاب وغیرہ کا رہین منت ہونا پڑتا ہے۔ جہاں ایک سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد انہیں ڈپلوما عطا کیا جاتا ہے۔

جامعہ کو دنیا کی صف اول کی جامعات کی ہمسر بنانے کے لئے ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ علمی و تمدنی زندگی کا کوئی شعبہ تشنۂ تکمیل نہ رہے۔

ارباب جامعہ کی توجہ مکرر صحافت کی پیشہ ورانہ تعلیم کے انتظام کی طرف منعطف کراتے ہوئے ہم متوقع ہیں کہ وہ اس خصوص میں عاجلانہ کارروائی عمل میں لائیں گے۔

مجلّہ کا ذاتی پریس

" افسوس پرچہ وقت پہ شائع نہ ہوسکا " ——— مدیرین مجلہ عثمانیہ کا یہ وہ قومی ترانہ ہے جسے ہر مدیر نے بلا تفریق مذہب و

ملت الاپا ہے۔ مجلہ کی سولہ سالہ جلدیں دیکھ ڈالئے، ہر شمارہ میں آپ کو پریس کی بدعنوانیوں کا ایک دفتر ملے گا۔ انتظامی مشکلات کو احاطۂ تحریر میں لانا اور طباعت کی دقتوں کے حدود کو متعین کرنا آسان نہیں۔ ؎

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

"مردہ بدست زندہ" والی مثل تو آپ نے سنی ہوگی۔ "مجلہ بدست مطبع" والی مثل بھی سُن لیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مجلہ کی بروقت اشاعت ناممکن ہے۔ ہماری رائے میں پریس کی تکالیف اور گوناگوں طباعتی مصائب کا واحد حل یہی ہوسکتا ہے کہ مجلہ کے لئے ذاتی پریس فراہم کیا جائے۔ پریس کی خریدی کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے حسب ذیل امور کی پابندی ناگزیر ہے۔

(۱) مجلہ عثمانیہ پریس فنڈ قائم کیا جائے۔

(۲) جملہ اساتذہ صاحبان جامعہ عثمانیہ کے لئے مجلہ کی سالانہ خریداری لازمی قرار دی جائے

(۳) ہر سال مجلہ کے موازنہ میں بچت برآمد کی جائے۔

اگر عالیجناب نائب معین امیر جامعہ آئندہ سال سے اساتذہ صاحبان جامعہ کے لئے مجلہ کی سالانہ خریداری لازمی قرار دیکر اس آمدنی کو پریس کے مقصد کے لئے بالکلیہ وقف فرمادیں نیز موازنہ کی بچت بھی سال بہ سال مذکورۂ بالا پریس فنڈ میں جمع ہوتی رہے تو قلیل مدت میں مجلہ کے لئے ذاتی پریس کے حصول کا موقع بہ آسانی پیدا ہوسکتا ہے اور بعد کو مجلہ کی ماہواری اشاعت کے امکانات پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

زائد امتحان

جامعہ عثمانیہ کی تاریخ میں اِس سال پہلی مرتبہ عثمانیہ کلیہ طبیہ کے ناکام متعلمین کے لئے زائد امتحان کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ گویہ طلباء کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا لیکن اِس سال انجمن اتحاد کلیہ طبیہ کے سرگرم

معتمد مسٹر سید عبد الجلیل اور ان کے رفقاءِ کار نے اس کو تسلیم کروانے کے لئے بڑی جد و جہد کی۔ آخر کار انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم اس خصوص میں برادرانِ کلیۂ طبیہ کو پُرخلوص مبارکباد دیتے ہوئے اربابِ جامعہ کی خدمت میں اپنا ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی طلباء کلیات فنون وسائنس و انجینیرنگ اور طالبات کلیۂ اناث کے لئے بھی زائد امتحان کے انعقاد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سال میں دو بار امتحان کا تجربہ مختلف جامعات میں اپنی دوررس افادیت کی بدولت نہایت کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ اس مطالبہ کی معقولیت اور واجبیت کو ثابت کرنے کے لئے دلائل و براہین کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ہمدرد اربابِ بست و کشاد سے قوی امید ہے کہ وہ کلیۂ طبیہ کے متعلمین کی طرح کلیات جامعہ عثمانیہ کے طلبہ و طالبات کیلئے بھی ان جائز مراعات کا بہت جلد اعلان فرمائیں گے۔

محمد علی نیر ایم۔ اے (آخری)
مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

فیروز

محمد قلی قطب شاہ سے قبل کا ایک اُردو شاعر

محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) بانی حیدرآباد سے قبل کے اُردو شاعروں کے نام تو ملتے ہیں لیکن کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ۹۸۸ھ سے قبل کے شعرائے اُردو میں ملا خیالی، فیروز، اور محمود کا ذکر اب تک قدیم اُردو شاعری کے کئی تذکروں میں چھپ گیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کے کلام کا بھی نمونہ اب تک نہ مل سکا تھا اور اسی لئے کسی تذکرے میں شائع نہ ہوسکا۔

اتفاق سے فیروز کی ایک مثنوی ادارۂ ادبیات اُردو کے قلمی نسخوں میں دستیاب ہوگئی جو ۹۷۲ھ سے قبل کی تصنیف ہے۔ اور آج سے ٹھیک ۳۹۰ سال قبل کی اردو کتاب ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

فیروز عہد ابراہیم قطب شاہ (۹۵۵ھ تا ۹۸۸ھ) کا ایک مشہور شاعر ہے جس کی استادی اور کمال کی شہرت قطب شاہی دور کے خاتمے تک عروج پر تھی۔ عہد محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعرا ملا وجہی نے اپنی کتاب قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) میں اس باکمال شاعر کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے:—

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں — دعادے کے چومے مرے ہاتھ کوں

کھیاہے توں یو شعر ایسا سرس — کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس

تو یوں کرکہ خصلت یو تج آئے نا — کہ توں خوش اچھے ہور کسے بھائے نا

توں ایسی طرز دل تے پنجا نوی — کہ دُسرے کریں سب تری پیروی

وجہی ترا ذہن جیوں برق ہے — تجے ہور بعضیاں میں لئی فرق ہے

(یعنے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو فیروز خواب میں آئے اور دعادے کر ہاتھ چومے اور ہمت افزائی کی کہ تو نے ایسے دلچسپ شعر لکھے کہ تمام عالم ان کو پڑھنا چاہتا ہے۔ اور نصیحت کی کہ تو ایسی خوبی نہ پیدا کر کہ خود تو خوش ہو اور دوسرے پسند نہ کریں۔ بلکہ تو ایسی نئی طرز اپنے دل سے نکال کہ دوسرے بھی اس کو پسند کرکے تیری پیروی کریں۔ اے وجہی تیرا ذہن برق کی طرح ہے اور تجھ میں اور دوسروں میں بڑا فرق ہے۔)

ملک الشعرا وجہی کے اِن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز کو وہ اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔ کیا تعجب کہ فیروز وجہی کا استاد ہو۔ جب ہی تو اس کے خواب میں آکر دعا دینے، نصیحت کرنے، اور تعریف و ہمت افزائی کرنے کا تذکرہ کرتا ہے۔

وجہی کے ایک عرصہ بعد ۱۰۶۶ھ میں گولکنڈہ کے ایک اور شاعر ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن میں بھی استاد الشعرا فیروز کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس امر پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ اس زمانہ میں استاد فیروز موجود نہیں ہیں جو میری شاعری کی سچی داد دیتے۔ اس کا شعر ہے۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد — جو دیتے شاعری کا کچ مرے داد

اس شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیروز اپنے تلامذہ کی بڑی ہمت افزائی کیا کرتا تھا اور شعرا اس کی داد کو شاعرانہ کمال کا اصلی صلہ سمجھتے۔ یعنی جس شاعر کی وہ تعریف کر دیتا اس کا کمال مستند و مسلم ہو جاتا۔

گولکنڈہ کے اس عظیم الشان شاعر کو اُردو دنیا گذشتہ دو صدیوں میں بھول چکی تھی۔ سب سے پہلے اس کو اُردو شہ پارے میں روشناس کیا گیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد دکن میں اُردو اور اردو ئے قدیم کے دوسرے ایڈیشنوں میں بھی اس کا ذکر شریک کیا گیا۔ اُردو شہ پارے میں اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ :۔

وجہی نے بھی قطب مشتری کے دیباچہ میں اس کو اُردو شاعری کا استاد بتایا ہے
وجہی اپنی شاعری کی خواہ مخواہ تعریف نہیں کرتا بلکہ اس کا بیان ہے کہ فیروز نے
خواب میں آکر اس کی شاعری کو تسلیم کیا۔ اور اس کی شاعری سے خاصہ اثر لیا۔
وجہی جیسے مغرور شاعر کا جب یہ خیال ہو تو ظاہر ہے کہ فیروز بہت بڑا شاعر
تھا۔ لیکن یہ نہایت بدقسمتی ہے کہ ان دونوں شاعروں (فیروز اور محمود) کے حالات
اور ان کے حالات اور ان کے کارناموں کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ اور
کچھ معلوم نہیں'' ص۴۳

ہماری یہ بدقسمتی ٹھیک چودہ[۱۴] سال بعد خوش قسمتی میں بدل گئی جب ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں خود فیروز کی کتاب ''توصیف نامہ'' داخل ہوئی۔ اور ہم اس قابل ہوئے کہ اس استاد شاعر کے کچھ حالات اور اس کے کلام کا نمونہ پیش کرسکیں۔ اُردو شہ پارے کی اشاعت کے بعد سے جن جن کتابوں میں فیروز کا ذکر کیا گیا وہ ان ہی ابتدائی معلومات پر مبنی تھا جو اُردو شہ پارے میں درج کی گئیں اور کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ فیروز کی نسبت معلومات میں کچھ اضافہ کرسکے۔

فیروز کی زیرِ نظر کتاب تاریخ ادب اُردو کے ایک اہم خلا کو پُر کرتی ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کے آغاز میں لکھا گیا ہے کہ اب تک سلطان محمد قلی قطب شاہ سے قبل کے بہت کم شاعروں کا پتہ چل سکا ہے اور گولکنڈہ کے تو کسی ایسے شاعر کا کلام نہیں ملا تھا۔ جس کا تعلق عہد ابراہیم قطب شاہ سے ہو یا جو محمد قلی قطب شاہ سے پہلے گزرا ہو۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ خود فیروز کی اس مثنوی سے اس کی نسبت کچھ معلومات حاصل ہوگئیں۔ اور کیا تعجب کہ اس کتاب کی طرح اس کی اور دوسری کتابیں بھی موجود ہوں اور بعد کو ہمیں دستیاب ہوجائیں۔

فیروز ملا خیالی کا ہم عصر اور ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا بڑا شاعر تھا۔ یہ کتاب اس نے محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش سے چند سال قبل لکھی تھی۔ وہ بیدر کے مشہور صوفی اور صاحب تصانیف عالم مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم کا معتقد اور مرید تھا۔

مخدوم جی شیخ محمد ملتانی کے بڑے صاحبزادے اور بیدر کے مشہور و معزز مشائخین میں سے تھے مشکوٰۃ النبوۃ اور دوسری کتابوں میں ان کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ وہ صاحب کشف و کرامات اور خارق عادات تھے۔ تصوف کے مسائل میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔

تذکرۂ اولیائے دکن میں لکھا ہے کہ:—

"باوجود کبر سنی تمام شب عبادت کرتے تھے۔ آپ عالم فاضل و ولی کامل تھے۔ جامع کمالات انسانی و فضائل روحانی تھے۔ دکن میں آپ کے خوارق مشہور رہیں۔" ۹۴۲ھ

اس کے بعد چند خوارق و عادات نقل کئے ہیں جن میں سے ایک کا خلاصہ یہ ہے کہ

"ایک شیعہ امیر شاہ جی المخاطب صدر جہاں کو سنی درویشوں سے کوئی اعتقاد نہ تھا۔ مخدوم جی کی شہرت سن کر ان کے امتحان کی خاطر دل میں یہ خیال کرکے آیا کہ اگر وہ حضرت علی کے فضائل بیان کریں گے تو میں ان کو درویش کامل سمجھونگا جب وہ مخدوم جی کی خدمت میں پہنچا تو وہ حضرت علی کے فضائل ہی بڑی خوبی سے بیان کرر ہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بڑا معتقد ہوگیا۔ اور اکثر ان کی خدمت میں آتا رہا۔"

مخدوم جی اپنے والد کے سجادہ نشین تھے۔ امیروں سے بہت کم ملتے اور کسی دنیادار کے

یہاں نہ جاتے۔ ان کے ذکر و شغل کی شہرت بیدر سے قلعہ گولکنڈہ تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں کے اکثر لوگ ان کے یہاں جاتے اور فیض پاتے۔ ان کے کمالات کا شہرہ سُن کر ایک وقت ابراہیم قطب شاہ نے بھی ملاقات کی درخواست کی تھی لیکن انہوں نے گولکنڈہ آنے سے انکار کردیا۔ یہ بادشاہ ایسے بزرگوں کا بڑا معتقد تھا۔ چنانچہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیاں مشائخین اور صوفیا سے بیاہ دی تھیں۔ اور اپنے بڑے لڑکے شاہ عبدالقادر کی شادی بھی بیدر کے مشائخ خاندان میں کی تھی۔ اس اعتقاد کی بناء پر عرض کرایا کہ مخدوم جی بیدر سے تشریف نہ لاتے ہوں تو نعلین ہی بھیج دیں تاکہ میں نعلین بوسی سے مشرف ہوں۔ مخدوم جی نے کہلا بھیجا کہ سلاطین درویشوں سے مدد چاہتے ہیں۔ میں آپ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ دعا میں شریک کرتا ہوں یہ کافی ہے۔

مخدوم جی نے ۲۲ شوال ۹۷۲ھ کو وفات پائی اور بیدر ہی میں مدفون ہوئے۔

فیروز نے اس مثنوی "توصیف نامہ" میں مخدوم جی کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ میں نے خواب میں حضرت محبوب سبحانیؒ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ مخدوم جی ہوبہو ویسے ہی ہیں۔ اسی لئے وہ ان کو جگہ جگہ محی الدین ثانی لکھتا ہے۔ وہ دعا کرتا ہے کہ وہ عرصہ تک زندہ رہیں تاکہ میں ہمیشہ مئے وحدت پیتا رہوں۔ وہ اپنے مرشد کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

مدح مخدوم جی

براہیم مخدوم جی جیو نا　　کہ مے صرف وحدت سدا پیونا

مرا پیر مخدوم جی جگ منے　　منگوں نعمتاں (میں سے ۱) اس کنے

کریں منجہ اُپر پیار اے پیو جگ　　کہ تجہ پیار تھے ہوے مند ہیر جگ

پیا جیو تھے تو ہمن باس ہے　　تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

وہی پھول جس پھول کی باس توں ۔۔۔ وہی جیو جس جیو کی آس توں
سوتوں روک ہے دین کا باردار ۔۔۔ جو تجہ چھانو تل جگ ہے پکڑیا قرار
اچھو منجہ اُپر چھانو تیرا جرم ۔۔۔ کہ آدھار میرا سو تیرا کرم
کریماں کی مجلس کرامت تجے ۔۔۔ امیناں کی صف میں امامت تجے
سدا مست مدہوش دیدار کا ۔۔۔ سچا توں طلب گار کرتار کا
محی الدین مخدوم جی جاگنا ۔۔۔ ہمیں جیو اُس پیر سوں لاگنا
اہے پیر مخدوم جی جائیا ۔۔۔ محی الدین دو جے یو جم آئیا
تجے را اونے جگت راتا جنم ۔۔۔ محی الدین سو توں کماتا جنم
مجے دان دے دین و دل شاد کر ۔۔۔ دنیا کے گناہاں تے آزاد کر
نگہبان میرا توں منج رکھ نگاہ ۔۔۔ مجے دو دے دشمن تھے تیرا پناہ
جسے پیر مخدوم جی پاک ہے ۔۔۔ اُسے دین و دنیا میں کیا باک ہے

یہ ابیات مسلسل نہیں بلکہ مختلف مقامات سے منتخب کی گئی ہیں اور ان سے مخدوم جی سے متعلق تاریخوں کے اُن بیانات کی تصدیق ہوتی ہے جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ البتہ اس واقعہ کا بھی علم ہوتا ہے کہ مخدوم جی گولکنڈہ کے اس شاعر کو بہت چاہتے اور اس پر بڑے مہربان تھے۔

فیروز کی زبان محمد قلی قطب شاہ سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن محمد قلی نے پنڈتوں اور ہندو ماہرین موسیقی کی صحبت میں ہندی کا عنصر اپنے کلام میں زیادہ کر دیا تھا۔ فیروز کے کلام کی روانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مشاق شاعر تھا اور اس مثنوی سے قبل اس نے شاعری میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

شاعر نے اپنا تخلص ان ابیات میں لکھا ہے۔

منگوں دان تجہ کن (توں) اپنا دے ۔۔۔ تو فیروز خستہ کو (ات) مان دے (۹۳)

سو فیروز سہنے ہیں پایا رتن — رکھیا سو رتن ڈھانک جیو سوں رتن (۵ب)

رتن خاص فیروز جب پائیا — پدک دل منے لال پسلائیا (۵ب)

افسوس ہے کہ فیروز کی اس مثنوی کا یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اصل مثنوی کتنی ابیات پر مشتمل تھی۔ بحالتِ موجودہ اس میں سو سے زیادہ ابیات ہیں اور یہ مخدوم جی کی زندگی ہی میں ۹۷۲ھ سے قبل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور مخدوم جی کی مدح میں قلمبند کی گئی ہے۔ اس کا آغاز و اختتام ان ابیات پر ہوتا ہے:۔

آغاز

تہیں قطب اقطاب جگ پیر ہے — تہیں غوث اعظم جہانگیر ہے

تہیں چاند باقی ولی تارے ہیں — توں سلطان سردار سبارے ہیں

اختتام

نگہبان میرا توں مجہ رکھ نگاہ — مجے دوے دشمن تھے تیرا پناہ

جسے پیر مخدوم جی پاک ہے — اُسے دین و ایمان میں کیا باک ہے

جسے پیر مخدوم جی سائیاں — دھرے ....

یہ نسخہ خطِ ثلث میں ۱۰۰۰ھ سے قبل نقل کیا گیا ہے افسوس ہے کہ کاتب نے لکھتے لکھتے کتابت ترک کر دی ہے۔ ورنہ استاد فیروز کا اس سے زیادہ کلام آج محفوظ ہو جاتا۔

سیّد محیّ الدین قادری زورؔ

روس کا شکسپیر

روس کا سب سے بڑا اور دنیا کا بہت بڑا شاعر "پشکن" ۲۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا۔ ادبی دنیا میں یہ روس کا پہلا نمائندہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "رومانیت" کی انقلابی تحریک ابتدائی مراحل سے کچھ ہی آگے گزر چکی تھی۔ یہ لڑائیوں، بغاوتوں، اور عہد آشوب کا روس تھا جبکہ آزاد خیال "پیٹر اعظم" ہر ایسی چیز جس میں روسی، قومی یا ایشیائی رنگ و بو تھا نکال کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی موقع پر گذشتہ صدی کے ایک مشہور روسی مصنف نے کہا تھا "پیٹر نے روس کو اعلان جنگ دیا۔ روس نے اس کے جواب میں پشکن کو پیدا کیا"۔

نو برس کی عمر تک اس میں غیر معمولی اور قبل از وقت نشو و نما کی کوئی علامتیں ظاہر نہیں ہوئیں لیکن بعد ازاں پڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور یہ روز افزوں ذوق و شوق اس کی آخری عمر تک جاری رہا۔ اس نے "پلوٹارک" کی "سوانح حیات" ایلیڈ اور اوڈیسی کے ترجمے پڑھے اور پھر گھر کے کتب خانے میں جتنی فرانسیسی زبان کی کتابیں تھیں سب چاٹ گیا۔ اس کے بھائی "لیو" کا بیان ہے کہ پشکن نے ۱۱ سال کی عمر میں تمام فرانسیسی ادب زبانی یاد کر لیا تھا۔ ۱۸۱۲ء سے اس کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہوتا ہے اسے "لائی سی" اسکول میں شریک کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کا اسکول کیریر کوئی نمایاں خصوصیت نہیں رکھتا۔ تاہم "لائی سی" کی تعلیمی فضا نے شاعر کے جوہر شاعری کو چمکانے اور ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا اور وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے معیاری اشعار لکھنے لگا۔ وہ فرانسیسی زبان کو اپنی زبان سے زیادہ اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اس نے پہلے فرانسیسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ "لائی سی" کے لڑکے

اُسے فرانسیسی شاعر پکارتے تھے لیکن یہ دور طویل نہ رہا اور وہ بہت جلد فرانسیسی زبان چھوڑ کر روسی زبان میں لکھنے لگا۔ ۱۸۱۳ء میں بزمانہ تعلیم اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ "سارخوف سیلو کی یاد" شائع ہوا۔ جس کا انتساب اُس نے اپنی بہن کے نام کیا تھا۔ یہ نوجوان اور پُرجوش نظمیں فرانسیسی ادب کے اثرات کا پرتو تھیں۔ ان میں بالخصوص والیٹر پارنے اور شی نیر کی تقلید کی گئی تھی۔ اگرچہ انہیں ایپج اور جدت پسندی کم تھی تاہم یہ نظمیں اس کی قوت فکر اور جوہر شاعری کا اس درجہ آئینہ دار تھیں کہ انہوں نے اُس وقت "کارم زین" اور "ہوخووسک" جیسے بڑے شعرا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ دونوں ادبی معاصر "پشکن" کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جبکہ وہ ہنوز اسکول بنچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ "پشکن" خود کو "ہوخووسک" کا شاگرد سمجھتا تھا۔ اگرچہ اُس نے بہ نسبت دوسرے شاعروں کے اس کی تقلید بہت کم کی۔

۱۸۱۷ء میں پشکن اپنی تعلیم "لائی سی" میں ختم کرنے کے بعد ۱۸۱۸ء سے "کارم زین" کی ادبی محفلوں اور "ہوخووسک" کی شام کی پارٹیوں میں مستقل طور سے حصہ لینے لگا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ "ہوخووسک" کی ادبی محفلوں میں جب اُس نے "روسلان لودمیلا" کا پہلا باب سنایا تو ہوخووسک نے اپنی ایک تصویر اس تحریر کے ساتھ "پشکن" کے نذر کی "شاگرد کو اُس کے شکست خوردہ استاد کی طرف سے" اس موقع پر ایک معاصر مشہور روسی شاعر "باتی یوش کود" جو اس قسم کی شاعری میں پہلے ہی سے درجۂ کمال حاصل کرچکا تھا اور جس نے روس میں شاعری کے ایک نئے اسکول کی بنیاد رکھی تھی۔ پشکن کی سنجیدہ اور منجھی ہوئی شاعری کو خود سے کہیں بہتر پاکر چلا اٹھا تھا:۔

"اُف ظالم نے کس استادی سے لکھنا شروع کیا ہے"۔

۱۸۲۰ء میں جب یہ نظم پہلی مرتبہ شایع ہوئی تو پبلک نے اس کا بہت پُرجوش استقبال کیا اور "پشکن" کی شہرت پر قطعی طور سے مہر لگ گئی۔ "بائرن" کی طرح اس نے سویرے اُٹھکر خود کو مشہور نہیں پایا بلکہ وہ شہرت کے محل میں فطری طور پر اُسی طرح داخل ہوا جیسے ایک نوجوان وارث اپنی جائز قانونی ملک میں قدم رکھتا ہے۔ یہ

رزمیہ نظم "روسلان لودمیلا" چھ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع دیہاتی روس کے متداول روایات و عقائد ہیں لیکن اس کا پس منظر اٹھارہویں صدی کا فرانس ہے جس میں کہیں کہیں ارسطو کا تخیل کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ نظم ہر قسم کے تصنع۔ رسمی اصطلاحوں اور استعاروں سے پاک ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی اشاعت کے ساتھ ہی روسی شاعری کے لئے ایک نئی راہ کھل گئی۔ فرانسیسی ادب کے یہ تاثرات جواب تک اس کی شاعری کا گہوارہ بنے رہے اس نظم میں آتشبازی کی طرح پھوٹ کر شعلہ فشاں ہوئے اور اُن کی تیز چنگاریاں رفتہ رفتہ فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے بکھر گئیں۔

فرانس کی اٹھارویں صدی کی شاعری کی خصوصیت "عاشقانہ رنگ" اور "عیش پسندی" تھی۔ اس قسم کی شاعری سے پشکن کی فطرت کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ وہ لااُبالی اور عیاشانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ اسی زمانے میں اُس نے سیاسی تحریک کے بعض باغیوں کے ساتھ شناسائی پیدا کی جن کو ڈسمبریوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سازش کی اصل غایت الگزنڈر اول سے بجبر آئینی حکومت حاصل کرنا تھی لیکن اس سازش کی خبر ہوگئی۔ سرغنوں کو سائبریا جلا وطن کر دیا گیا۔ اور "پشکن" جنوبی روس کے ایک قصبے "اکاتری نوسلات" بھیجا گیا۔ اس جلاوطنی سے پہلے جو باغیانہ نظمیں شاعر نے لکھی تھیں ان میں سے میں ایک نظم کا ذکر کردوں گا۔ یہ نظم انقلابیوں کے لئے کہی گئی تھی۔ اس گیت میں ہم پشکن کی انقلابی آواز سنتے ہیں۔ ایک دلیرانہ پیام تھا اور اس میں سائبریا کے جلاوطنوں کو ان کے مستقبل کے متعلق ایک زبردست امید دلائی گئی تھی۔ نظم سنئیے۔

سائبریا کے معدنی کانوں میں ــــــ اپنے صبر کو مغرور رکھ، اور آہستہ آہستہ کام کیے جا ــــــ نہ تو تیرا یہ غمناک عمل رائیگاں جائے گا ــــــ نہ ہی تیرے تخئیل کی بلندی پست ہوگی ــــــ تیرے تاریک، زمین دوز محبسوں کی سلاخوں کے پیچھے ــــــ ایک دن دوستی اور محبت تجھے خوش آمدید کہے گی ــــــ اور اُس وقت تیرے مجرم قرار دیے ہوئے ضمیر کے

اندر ـــــ میری آزادی سے محبت کرنے والی آواز گونجے گی ـــــ تیری بھاری زنجیریں ٹوٹ کر گر جائیں گی ـــــ تیرے قید خانے پاش پاش ہو جائیں گے اور آزادی ـــــ وفور مسرت کے ساتھ دروازے پر تیرا استقبال کرے گی ـــــ تیرے بھائی تیرے ہاتھ میں تلوار تھما دیں گے

۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۴ء تک "پشکن" جنوبی روس میں رہا۔ یہ اس کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔ آ بائرن اُس کا پسندیدہ شاعر تھا اور اس دور کی تمام تر شاعری پر بائرن کا گہرا پرتو ہے۔ بائرن یورپ کا مقبول ترین شاعر اپنی تمام رومانیت کے ساتھ اُس پر مسلط تھا اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بائرن سے یہ عقیدت متعدد حسین نظموں کی تخلیق کا باعث ہوئی بایں ہمہ دونوں شاعروں کی سیرت اور ذہنی رجحان میں اس قدر انقلاب تھا کہ پشکن پر بائرن کا رنگ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس بائرنیت نے "پشکن" کے لئے اس کی اپنی غیر معمولی فطری ذہانت کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے صرف ایک سیڑھی کا کام کیا۔ جو لطیف معنوں میں تخیلی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تھا۔

جنوبی روس سے واپس ہوتے وقت شاعر نے کریمیا' قاف اور متعدد مقامات کی سیر و سیاحت کی۔ کریمیا کے ماحول نے اُس کی رومانی مزاج میں ایک نئی جولانی پیدا کی۔ اس وقت کریمیا ایک تباہ حال اسلامی شہر تھا' جو اسلامی' عیسائی' یہودی اور مختلف تمدنوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ یہاں کے قہوہ خانے' سرو اور مسجدوں کی قطاروں میں گھری ہوئی سفید شاہراہیں اور نازک نازک نقاب پوش عورتیں ـــــ یہ وہ مناظر تھے جن سے ہمارا شاعر بہت متاثر ہوا۔ یہیں اس نے اپنی طویل بہترین نظم "باغچی سرائے کا چشمہ" لکھی۔ پھر جب وہ قاف گیا تو وہاں کی طویل مسلسل پہاڑیاں' دلفریب قدرتی مناظر اور وہاں کے باشندوں کی فطری آزادی اُسے ایسی بھائی کہ اُس نے اُس پر ایک نظم "قاف کا قیدی" ۱۸۲۰ء میں تصنیف کی۔ بعد ازاں وہ بسریبیا کے دارالخلافہ میں کش نیف میں مقیم ہوا۔ یہ کسی زمانے میں اہل روما کے قبضہ میں تھا اور اس وقت خانہ بدوش جپسیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ "پشکن" نے اپنی بلند پایہ تصنیف جپسی ۱۸۲۷ء میں اسی

مقام پر لکھی۔ بسر بیا میں "پشکن" کا قیام اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اُس کا تخلیقی جوہر اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنے ایام جوانی کے مصنوعی کلاسکل اثرات سے آزاد ہو کر جدید اور خارجی تجربات کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ یہاں اُس نے بہت سی بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ ان میں "شاعری کی دیوی" اور "او لینج کا نغمہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں "پشکن" نے یہیں اپنی سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا نظم "یوگینی انی گن" کی بنا ڈالی۔ یہ نام اس نظم کے ہیرو کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ زبان اور موسیقیت کے اعتبار سے روسی ادب کی لطیف ترین چیزوں میں سے ہے۔ "یوگینی" کی تصنیف میں ۹ سال صرف ہوئے۔ یہ نظم رومانی شعرا کے قدیمی اور مسلمہ اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ بائرن کی "ڈان جوان" اور "مادام دے اسٹیل" کی "دلفین" کی طرح یہ بھی واردات انسانی کا ایک زبردست مرقع ہے اور اتنی جدید ہے جیسے کہ آجکل کے ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اس شہرۂ آفاق تصنیف کا ذکر میں ذرا تفصیل کے ساتھ کروں گا۔

ہیرو ـــــ "یوگینی انی گن" ایک امیر باپ کا بیٹا ہے۔ لاڈ پیار میں پرورش پاکر اوباشوں کی صحبت اختیار کی۔ آوارگی جزو زندگی بنی اور بنتی گئی۔ لیکن پھر ایک انقلاب آیا اور وہ ان حسین گناہوں سے بیزار ہو گیا۔ شہر کو چھوڑ گاؤں کو آیا۔ یہاں بھی جی نہ لگا۔ طبیعت نہ بہلنا تھی نہ بہلی۔ اضطراب۔ خلش۔ یاس اور افسردگی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ناگاہ "لارن" نام کے ایک معزز خاندان کی دو نوجوان خوبصورت لڑکیوں سے اس کا تعارف ہوا۔ "تت یانا" اور "دولگا" بہنیں بہنیں تھیں۔ "تت یانا" بڑی تھی۔ یہ ایک خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی جس کی کل کائنات بس اس کے تخیلات کی مغموم فضا تھی جس میں ہر وقت وہ ڈوبی رہتی۔ ـــــ "انی گن" سے جس وقت اس کی پہلی ملاقات ہوئی اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کی زندگی کا سوز اس کی سانس کی گرمیوں سے پگھلنے لگا ہے اور وہ جیسے آج تک اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن افسوس کہ "انی گن" کی طرف سے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا گیا۔ اور اس روح فرسا خاموشی سے تنگ آکر

نادان لڑکی نے اُسے ایک محبت نامہ لکھا جس میں "اعترافِ محبت" کیا۔ "انی گن" نے خلاف توقع جواب دیا — "گھریلو زندگی میری قسمت میں نہیں۔ محبت سے میری روح ناآشنا ہے۔ تمھارا میرے ساتھ رہنا اپنے حسن وجمال کو برباد کرنا ہے کیونکہ میں تمھارے پاک جذبات اور معصوم حسن کی قیمت کو نہیں سمجھ سکتا۔"

اس واقعہ کے بعد "انی گن" نے گاؤں چھوڑ دیا اور یورپ کے سفر کو چلا گیا — زمانہ گزرتا گیا۔

"تت یانا" اپنی محبت کی دبی ہوئی آگ میں خاموشی کے ساتھ جلتی رہی۔ اِس جلن ہی میں اُس کے دل کی ٹھنڈک تھی۔ اُس نے عہد کرلیا کہ وہ کبھی شادی نہ کرے گی لیکن ماں باپ نے اس "ہٹ" کو نہ مانا اور انہوں نے ماسکو کے ایک امیر جنرل سے اُس کا بیاہ کردیا۔ "انی گن" یورپ کی سیر سے واپس آیا اور ایک محفل رقص میں اچانک ان کی ملاقات ہوئی۔ "تت یانا" کا دل اب تک اس کی لگائی ہوئی آگ میں دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ لیکن وہ ایک خود دار عورت تھی۔ دل کی بات کو دل ہی میں رکھا۔ مگر آنکھوں نے غمازی کی۔ "انی گن" سب کچھ سمجھ گیا۔ بہت متاثر ہوا۔ چاہا کہ پرانے تعلقات پھر قائم کرے۔ یہ پچھتاوا بعد از وقت تھا اور اس لئے وہ بیمار ہوگیا۔ اسی حالت میں ایک دن "تت یانا" کے مکان پر پہنچا۔ شوہر گھر پر نہ تھا۔ "تت یانا" نہ جانے کیوں کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی — اور وہ بولی "کیا میں غلط کہتی ہوں کہ اسی بستی سے کچھ دور — جہاں ہماری محبت کو رسوائی کا ڈر نہ تھا — تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا؟ اب کون سی بات ہوئی — کہ تم مجھے چھیڑنے آئے ہو — جو کچھ ہونا تھا سو ہوچکا — تم کو جاننا چاہیئے میں نے شادی کرلی ہے — میں تمھیں فریب نہیں دیتی۔ میں تمھیں چاہتی ہوں — لیکن اب میں کسی اور کی بیوی ہوں — اور وفاداری میرا فرض ہے —"

"تت یانا" کمرہ چھوڑ کر چلی گئی — یہ داستان یہاں ختم ہوجاتی ہے اور پڑھنے والا کچھ سوچنے لگتا ہے۔

ماسکو واپس آنے پر اُس کی بڑی آؤبھگت ہوئی لیکن کسی عدول حکمی کی پاداش میں اُسے پھر جلاوطن

کیا گیا لیکن جلد ہی معافی بھی دیدی گئی۔ اور جب "زار نکولائی اول" کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنے آپ کو "پشکن" کا محتسب قرار دیا اور اُسے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مامور کیا۔ اس موقع پر ایک روایت یہ بہت مشہور ہے کہ شہنشاہ نے اسی شب کو محفل رقص میں اپنے ایک مصاحب خاص سے کہا تھا "آج میں نے روس کے سب سے زیادہ ذی ہوش شخص سے بات کی ہے"۔

۱۸۳۱ء میں پشکن نے ایک نوجوان حسین لڑکی "نتالیا گنچاروو ا" سے شادی کر لی۔ یہ ایک فضول خرچ، سرد مہر، آوارہ اور کمزور کردار کی سوسائٹی پرست عورت تھی۔ ازدواجی زندگی میں اس کو اپنے شوہر کے ساتھ جو کچھ بھی ہمدردی رہی اس کا سبب اُس کی پرجوش محبت نہ تھی اُس نے اُس سے بغیر محبت کے شادی کی تھی اور "پشکن" یہ بات جانتا تھا اُسے امید تھی کہ وہ محبت کا سچا جذبہ اُس میں بھی پیدا کردے گا لیکن باوجود اپنی خالص محبت کے وہ کبھی کامیاب نہ ہوا۔ اس نے ایک قانونی بیوی کی حیثیت سے خود کو اس کے حوالے کیا نہ کہ ایک پرستار چاہنے والی شریک زندگی کی حیثیت سے "نتالیا" کی اس بے رخی کا اظہار اس نے اپنی متعدد نظموں میں کیا ہے۔ یہ نظم دیکھئے :-

اُف تو کتنی زیادہ حسین اور کتنی مغرور ہے ــــــــ اور کتنی زیادہ تکلیف کے ساتھ میں تجھ سے خوشی حاصل کرتا ہوں ــــــــ میری طویل التجاؤں کو گھیرنے کے بعد ــــــــ تو اپنی نزاکتوں کے ساتھ خود کو میرے حوالہ کرتی ہے ــــــــ افسوس تو ہر چیز سے بے خبر ہو کر شرماتی اور جھجکتی ہوئی ــــــــ میرے جذبات کا جواب بیباک ہو کر نہیں دیتی ــــــــ لیکن یہ شعلہ زیادہ اور زیادہ تجھ میں پھیلتا جاتا ہے ــــــــ یہاں تک تو اپنی طبیعت کے خلاف میرے شعلوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ پشکن اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو اپنے رنگ میں رنگ لے لیکن ایسا نہ ہوا۔ معاملہ حد سے گزرتا گیا۔ ۱۸۳۶ء میں تو عام طور پر شہر میں "نتالیا" کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پھر اس مضمون کے گمنام خطوط "پشکن" کے پاس آنے لگے کہ ایک

فرانسیسی افسر "ڈی اینتھس"، اُس کی بیوی سے اظہار تعشق کرتا ہے۔ خوددار "پشکن" اب زیادہ اپنی توہین گوارا نہ کرسکتا تھا۔ اُس نے "ڈی اینتھس" کے پاس پیام مبارزت بھیجا۔ یہ ڈوِل ۲۷ جنوری کے دن ہوئی جس میں "پشکن" مہلک طور پر زخمی ہوا اور دو دن مسلسل تکالیف برداشت کرنے کے بعد یہ نوجوان شاعر عالم شباب میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ مرتے وقت اس شاعر اعظم کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے:۔

"زندگی ختم ہورہی ہے۔ سانس لینا مشکل ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے"۔

"الگزنڈر پشکن" اپنے ہموطنوں کی عظمت، اُن کے زوال، دکھوں اور خوشیوں کو اشعار میں ظاہر کرنے والا سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ خالص شاعر تھا۔ اُس کا تخیل ہمیشہ بلندی کی طرف مائل رہا۔ وہ اپنے خیالات کو بہتر سے بہتر الفاظ میں ادا کرنے پر قادر تھا۔ اس کی شاعری جدّت۔ اسلوب بیان، سادگی اور صفائی کے اعتبار سے روسی ادب میں خاص انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ اُس کے استعمال کئے ہوئے الفاظ سادہ، برجستہ اور نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔ یہ شاعر اعظم بالخصوص اپنے عشقیہ رنگ کی وجہ سے ممتاز ہے اور اُس نے عشق، یاس اور امید کے پس منظر پر بہترین نظمیں لکھیں۔ اُس کے گیتوں کی آواز اب بھی روس کے میدانوں میں گونج رہی ہے۔ اب میں "پشکن" کی ایک نظم پیش کروں گا۔ ذیل کی نظم اُس کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ ہر اعتبار سے اتنی جامع اور مکمل ہے کہ کوئی ترجمہ اصل کی حقیقی ترجمانی نہیں کرسکتا۔ تاہم جذبات کی روانی کا ایک دھندلا نقشہ کھینچا جاسکتا ہے۔ وہ نظم یہ ہے:۔

اور مجھے اپنی زندگی کی وہ مختصر ملاقات یاد ہے ـــــــ جب تو اپنی نزاکت تمام کے ساتھ ـــــــ ایک حسین خواب کی مانند حسن مجسم بن کر ـــــــ میرے سامنے ظاہر ہوئی ـــــــ جب میں مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر جاتا ہوں ـــــــ اور پُر ہول تفکرات کے بھیانک سایے مجھے ڈراتے ہیں ـــــــ تب تیری شیریں آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے ـــــــ اور تیرے چہرے کے حسین مبہم نقوش میری آنکھوں میں ناچنے لگتے ہیں ـــــــ

دور ــــ بہت دور- جلاوطنی کی بیکسی میں ــــ میری زندگی آہستہ آہستہ اپنی بوجھل گاڑی کھینچ رہی تھی ــــ بغیر خدا ــــ اور بغیر روحانی فیضان کے ــــ بغیر آنسو ــــ بغیر محبت اور بغیر زندگی کے ــــ تب میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ کوئی چیز آئی ــــ میں نے تجھے دیکھا ــــ ساری لطافتوں کے ساتھ ــــ جب تو ایک حسین خواب کی مانند حسنِ مجسم بن کر ــــ میرے سامنے ظاہر ہوئی ــــ میرا دل اب غایت انبساط سے دھڑکتا ہے ــــ اور آسمانوں کی بلندی سے اُس کے اندر ــــ خدا اپنے روحانی فیضان کے ساتھ چھُپ کر آتا ہے ــــ اور زندگی آنسوؤں سے مل کر ایک مقدس محبت میں تحلیل ہو جاتی ہے :

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

قطعہ

بساطِ عرش پہ اپنا مقام پیدا کر ہر ایک ذرّہ سے ماہِ تمام پیدا کر

نہ بیچ لعل و گہر کیلئے زباں اپنی جو دل کا تیر بنے وہ کلام پیدا کر

سیّد محمد یوسف ناظم متعلم ایم-اے (آخری)

جنوبی ہند کی اُردو خدمات

(مقالہ کل ہند اُردو کانفرنس منعقدہ بنگلور)

صدر عالی قدر، معزز خواتین و حضرات ۔ "جنوبی ہند کی اُردو خدمات" کا عنوان آج کی محفل کے لئے نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا عنوان ہے جس پر گھنٹوں بولا جا سکتا ہے اور ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے ۔ لیکن میں نہایت اختصار کے ساتھ اپنے ناچیز خیالات کو آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں ۔ اُردو کا پہلا ادبی دور دکن میں سنہ ۱۵۹۰ء تا سنہ ۱۷۳۰ء قرار دیا جا سکتا ہے ۔ جو قطب شاہی بادشاہوں، بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے جانشینوں کے عہد پر ختم ہوتا ہے ۔ گولکنڈے کے قطب شاہی شاعروں میں اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ فرمان روائے گولکنڈہ ہے ۔ وجہی ۔ غواصی اور ابن نشاطی اردو شاعری کے اولین معمار ہیں ۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دور حکومت سنہ ۱۵۸۰ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۶۱۱ء پر ختم ہوتا ہے یہ بادشاہ ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھا ۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شاعری ساحری سے کم نہیں ۔ وہ نہ صرف اُردو ہی کا شاعر تھا بلکہ فارسی اور تلنگی میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے ۔ اس کا کلیات تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ جس کو عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے بڑی تحقیق محنت اور خوش اسلوبی سے شایع کیا ہے ۔ کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس میں اس نے اپنا کمال نہ دکھایا ہو ۔ قصیدے ۔ غزلیات ۔ قطعات ۔ مخمس ۔ مسدس ۔ غرض

ہر صنف پر اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ ملا وجہی گولکنڈے کے قدیم اور ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے ہے۔ اس کی نثر کی کتاب "سب رس" اُردو نثر کا پہلا شاندار کارنامہ ہے جو ۱۶۳۴ء میں لکھی گئی۔ اس کی دوسری کتاب ایک شاندار مثنوی "قطب مشتری" ہے یہ بھی شایع ہو چکی ہے۔ اس مثنوی میں کئی غزلیں بھی ہیں۔ اس دور کا تیسرا نامور شاعر غواصی بھی ایک بلند پایہ سخن گو تھا۔ اس کی دو کتابیں "سیف الملوک بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدرآباد" کی طرف سے شایع ہو چکی ہیں۔ ابن نشاطی نے ۱۶۵۵ء میں ایک طویل مثنوی "پھولبن" لکھی جسے پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری صدر شعبۂ اُردو و فارسی "عثمانیہ" نے "مہاراجہ کالج میسور" نے نہایت تحقیق اور محنت سے شایع کیا ہے۔

بیجاپور کی سلطنت بھی برسوں اُردو علم و ادب کا گہوارہ بنی رہی اور اپنی علم نوازیوں سے اُردو کی تہی دامنی کو علمی جواہر سے مالا مال کر دیا۔ بیجاپور میں اُردو ادب کا بانی سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی تھا جس کا دور حکومت ۱۵۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۶۲۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس بادشاہ کا علمی و ادبی ذوق بہت اعلیٰ پایہ کا تھا۔ اس کا دربار عالموں اور فاضلوں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ ادب کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو فن موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا چنانچہ اس نے فن موسیقی کے متعلق ہندی زبان میں ایک کتاب "نورس نامہ" لکھی تھی جس کا دیباچہ فارسی کے مشہور انشا پرداز ملا ظہوری نے لکھا ہے۔ جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علم نوازیوں کی شہرت سن کر بیجاپور آیا تھا۔ اور یہاں کی علمی و ادبی فضاؤں اور شاہانہ سرپرستیوں نے اس طرح اس کا دل موہ لیا کہ وہ یہیں پیوند خاک ہوا۔

بیجاپور کے عادل شاہی فرمانرواوں نے بھی دل کھول کر اُردو کی سرپرستی کی اور اس دور میں بھی کئی بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے جس میں ملا نصرتی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو سلطان علی عادل شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ اس کی تین مثنویاں اُردو شاعری میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی "گلشن عشق" جس میں آٹھ ہزار ابیات ہیں۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" ہے جس میں علی عادل شاہ کی عظیم الشان

مہمات کا ذکر ہے۔اس کی تیسری مثنوی "معراج نامہ" ہے۔اس میں خاص دکنی الفاظ اور ترکیبیں بہت زیادہ ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح قوموں اور حکومتوں کو عروج و زوال ہوتا ہے اسی طرح زبان میں بھی عروج و زوال ہوتا ہے۔اور حکومت کے زوال کے ساتھ اس زبان کو بھی زوال آجاتا ہے جو اس کے سایے میں پروان چڑھتی ہے۔چنانچہ جب عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا نیرِ اقبال غروب ہوا تو اُردو زبان اور ادب پر بھی کالی گھٹائیں چھا گئیں۔بیجاپور اور گولکنڈہ جو کسی زمانہ میں اُردو علم و ادب کے مرکز تھے تباہ و برباد ہوگئے۔نہ وہ شاہانہ سرفرازیاں رہیں اور نہ پہلی سی ادب نوازیاں۔بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اورنگ آباد علم و فضل کا مرکز بنا۔اور اس شہر کو شہنشاہ اورنگ زیب کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔اس سرزمین میں ولؔی اور سراؔج جیسے دو نامی گرامی شاعر پیدا ہوئے۔جنھوں نے اُردو شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ ان کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ گئی۔ولؔی اپنی تعلیم کی تکمیل کے سلسلہ میں گجرات بھی گئے تھے۔اور ایک عرصے تک وہاں قیام کیا تھا۔ان کے اس طویل قیام سے بعض محققین کو یہ شبہہ ہونے لگا کہ ولؔی گجرات کے رہنے والے تھے۔ولؔی کو گجرات سے خاص لگاؤ تھا۔بالخصوص شہر سورت ان کے من کو بہت بھایا اور اپنی ایک مثنوی "در تعریف سورت" میں انھوں نے اس سے اپنی دلبستگی کا اظہار کیا ہے۔غالباً ولؔی نے ۱۷۰۰ئہ میں دلی کا سفر کیا۔یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دلی میں فارسی میں شعر کہنے کا رواج تھا۔اور اہل دلی اس بات سے بے خبر تھے کہ تقریباً چار سو برس سے اُردو میں شاعری کی جارہی ہے۔ولؔی کی اُردو شاعری سے وہ بہت متاثر ہوئے اور یہ محسوس کیا کہ اُردو زبان میں بھی یہ صلاحیت ہے کہ جس کے ذریعہ جذبات اور خیالات کا عمدہ طریقے سے اظہار کیا جاسکتا ہے۔غرض ولؔی کے اس سفر نے شمالی ہند کی اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔دلی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ولؔی اپنے وطن واپس ہوئے۔ولؔی کی شاعری میں مختلف اصنافِ سخن موجود ہیں۔لیکن غزل پر انھوں نے زیادہ توجہ کی۔"دیوان ولیؔ" انجمن ترقی اُردو"

کی طرف سے شایع ہو چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے وؔلی کی شاعرانہ عظمت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اُردو شاعر کی حیثیت سے وؔلی کی جتنی قدر و منزلت ان کی زندگی اور ان کی موت کے بعد ہوئی شاید ہی کسی اُردو شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ ان کے شاعرانہ کمال کے اعتراف میں چند سال قبل حیدرآباد میں یوم ولی بڑے شاندار پیمانے پر منایا گیا۔ وؔلی کے بعد دوسری ہستی جو اس خاک پاک سے اُٹھی وہ حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کی تھی۔ سؔراج ۱۱۲۸ء؁ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے شاعرانہ کمال کی وجہ سے وؔلی کے بعد سب سے بڑے استاد مانے گئے۔ شاہ سراج کا ایک ضخیم کلیات منظر عام پر آچکا ہے جس کو پروفیسر سروری صاحب نے اپنے ایک بصیرت افروز مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

اس دور کے ختم ہو جانے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک دکن کی اُردو نوازیوں کے چرچے کم ہوئے۔ اور اب عہد عثمانی کی فیاضانہ سرپرستیوں کی وجہ سے گزشتہ ربع صدی سے حیدرآباد میں اُردو کی گراں بہا خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں دکن نے اپنے لیے ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی ہے۔ موجودہ عہد میں تو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی شاہانہ اُردو نوازیوں کے باعث اُردو کی ترقی میں برق رفتاری پیدا ہوگئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی شکل میں ظل ہمایونی نے وہ احسان فرمایا ہے جو نوجوان پود کے افکار و اعمال کی فطری ترقی کا صحت بخش ذریعہ ثابت ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ بقول پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب پرو وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ "علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا اس سرزمین پر آزاد کیا گیا"۔

یوں تو اس دور میں کئی شاعر پیدا ہوئے لیکن کیفؔی۔ توفیقؔ اور ذہینؔ مقبول خاص و عام ہوئے۔ زندہ شاعروں میں حکیم الشعرا حضرت امجد کا کلام اور خاص کر ان کی رباعیاں سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ان کی نظم و نثر کے کئی مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امؔجد کی تصنیفات اُردو ادب میں ہمیشہ نمایاں حیثیت کی حامل رہیں گی۔ اس دور کے ایک اور شاعر حضرت صؔفی اورنگ آبادی ہیں۔ زیادہ تر غزل کہتے ہیں جس میں ان کی رندمشربی آزادروی اور بے ساختگی کی جھلک

نمایاں رہتی ہے۔ ان کا کلام ابھی تک کتابی صورت میں شایع نہیں ہوا اگر یہ شایع ہو جائے تو اُردو غزل کے سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ اُردو کے انشاء پردازوں اور محققین میں مولوی سید خورشید علی صاحب۔ مولوی ظفریاب خاں صاحب۔ مولوی شمس اللہ صاحب قادری۔ مولوی سردار علی صاحب۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حیدر آباد کی قدیم انجمنوں میں انجمن ترقی اُردو نے جس کا دفتر اب دہلی میں منتقل ہو چکا ہے اُردو زبان کی وہ خدمات انجام دی ہیں جس پر حیدر آباد بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ اس انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کا وہ کام کیا ہے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ حکومت حیدر آباد کی طرف اس انجمن کو سالانہ تقریباً ایک لاکھ کی امداد مختلف شکلوں میں دی جاتی ہے۔ یہ انجمن اُردو کی لغت ترتیب دینے کے کام میں مصروف ہے۔ اگر یہ لغت چھپ جائے تو اُردو زبان کا ایک بہت بڑا یادگار کارنامہ ہوگا۔ حیدر آباد کی تعلیمی ترقی میں حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ اُردو کی ترقی اور وسعت کے لئے اس انجمن کی خدمات کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔

اس دور کا سب سے درخشاں کارنامہ جس نے اُردو کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا جامعۂ عثمانیہ کا قیام ہے۔ اس یونیورسٹی کو قائم کرنے والوں نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ایک عملی تجربہ کیا تھا جو صد فی صد کامیاب ثابت ہوا۔ جامعۂ عثمانیہ کے اساتذہ میں مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ مولوی ہارون خاں صاحب شروانی۔ مولوی الیاس برنی صاحب۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور مولوی جمیل الرحمٰن مرحوم نے اپنے اپنے فن پر اُردو زبان میں قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ اس جامعہ کے تعلیم یافتہ اصحاب میں جو اب اس جامعہ میں بحیثیت پروفیسر کام کر رہے ہیں قابل ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری (جو حال ہی میں جامعۂ میسور میں منتقل ہو گئے ہیں)۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

ہیں۔ ان اصحاب نے اپنے موضوعوں سے متعلق اُردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں جو تمام ہندستان میں قدر کی نظروں سے دیکھی گئیں۔ ان میں سے بعض پروفیسروں مثلاً ڈاکٹر زور صاحب اور پروفیسر سروری صاحب کی ایک سے زیادہ کتابیں ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ اول الذکر بحیثیت محقق زبان و تنقید نگار سارے ہندستان میں مشہور ہیں اور موخر الذکر نے جدید اُردو شاعری اور فن افسانہ نگاری پر قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے تحت ایک دار الترجمہ بھی ہے جس نے اب تک غیر زبانوں کے مختلف علوم و فنون کی بیسیوں کتابوں کو اُردو زبان میں منتقل کیا ہے۔

آج سے تقریباً بارہ سال قبل حیدرآباد کے چند بہی خواہان اُردو کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان و ادب کی خدمت ایک اجتماعیت کے ذریعہ عمل میں لائی جائے اور وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اُردو کا قیام عمل میں آیا۔ اس قلیل عرصہ میں ادارے نے اُردو زبان کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس سے اہل اُردو ناواقف نہیں ہیں۔ ادارے کا کام مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اب تک ایک سو کے قریب کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ ادارے نے گزشتہ تین سال سے اُردو امتحانات کی مہم کا آغاز کیا ہے جس میں اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ پہلے سال دو سو پچھتر دوسرے سال چھ سو اور تیسرے سال تقریباً چودہ سو امیدواران امتحانوں میں شریک تھے۔ امتحانات کے سنٹر مختلف مقامات پر قائم کئے جاتے ہیں اور کامیاب ہونے والوں کو سندیں اور انعامات عطا کئے جاتے ہیں۔ دوسرا اہم کام جو ادارے کے پیش نظر ہے وہ اُردو انسائکلو پیڈیا کی ترتیب ہے۔ اس کام میں ادارے نے تمام ہندستان کے علماء و فضلا کا تعاون حاصل کر لیا ہے۔ اور اس کام کے ابتدائی مراحل طے کر لئے گئے ہیں۔ اُردو انسائکلو پیڈیا کی پہلی جلد کا مسودہ مرتب ہو چکا ہے۔ جنگ کی وجہ سے کاغذ نہ ملنے اور طباعت کی دشواریوں کے باعث یہ جلد طبع نہ ہو سکی۔ لیکن اب کاغذ اور طباعت کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اور توقع ہے کہ ۱۹۴۳ء میں پہلی جلد طبع ہو کر منظر عام پر

آجائے گی۔ صوبہ مدراس میں اُردو زبان عرصہ دراز سے بولی جاتی ہے۔ اور خاک مدراس نے ایسے نامور شاعر وانشا پرداز پیدا کئے جن کے کارنامے آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ مدراس کی اُردو خدمات کا اندازہ موجودہ حالات سے نہیں بلکہ ایک صدی قبل کے حالات سے لگایا جاسکتا ہے۔ مدراس میں اُردو کی ابتداء سنہ ۱۱ھ سے قبل ہوچکی تھی۔ اس کے کچھ زمانہ کے بعد کے شاعروں میں سب سے پہلے لالہ جیسونت رائے کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا تخلص منشی تھا۔ وہ اُردو کے ایک اچھے شاعر تھے اور ایک مثنوی "گلدستۂ عشق" کے نام سے تصنیف کی تھی۔ ارکاٹ کے اُردو شاعروں میں والہ اور باقر آگاہ کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ والہ کا مسلک صلح کل تھا۔ وہ نہ صرف ایک بڑے شاعر تھے بلکہ اپنے زمانے کے بلند پایۂ نقاد بھی تھے۔ ان کی ایک مشہور عشقیہ مثنوی" طالب وموہنی" ہے جو ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے اِس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ باقر آگاہ ۱۱۵۸ھ میں ویلور میں پیدا ہوئے ان کا شمار اپنے زمانے کے علماء میں ہوتا تھا۔ ان کا دیوان کافی ضخیم ہے اور اس کے کئی نسخے مختلف اصحاب کے پاس موجود ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف اور معرفت کی جھلک نظر آتی ہے ؎

بتوں کے عشق میں رکھیو مجھے معذور اے زاہد کہ میں آئینۂ دیدار میں ان کے خدا پایا

باقر آگاہ کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہشت بہشت ہے جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم اور ایک نسخہ پیرس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب مدراس اور بمبئی میں کئی بار چھپ کر بہت مقبول ہوئی۔ سنہ ۱۲۰۰ھ سے لیکر سنہ ۱۳۰۰ھ تک اُردو کو صوبہ مدراس میں بڑا عروج رہا۔ اس دور کے بعض مشہور شاعروں میں غلام اعزالدین خاں۔ بہادر مستقیم جنگ نامی اور غلام محی الدین مبجز کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ آخری دور سنہ ۱۳۰۰ھ سے موجودہ زمانے تک کا قرار دیا جاسکتا ہے اِس دور کے شاعروں میں شمس العلماء نواب عبدالرحمٰن خاں شاطر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے کلام کی وجہ سے سارے ہندستان میں مشہور رہیں۔ رؤف احمد صاحب پرتو بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ اور اب تک ان کے تین دیوان شایع ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ ذوقی۔ کمالی اور فانی کا کلام رسالہ مصحف۔ اور نظمی کا کلام جلوۂ سخن میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اس دور کے نثر نگاروں میں یعقوب حسن صاحب۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب۔ ڈاکٹر قطب الدین صاحب، عبدالجبار صاحب۔ سید صبغتہ اللہ حسینی صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد حسین صاحب محوی کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ اگرچہ کہ پیدائش کے لحاظ سے مولانا کا تعلق لکھنؤ سے ہے لیکن آپ گزشتہ کئی سال سے مدراس میں مقیم ہیں۔ اور مدراس میں اُردو کی ترقی کے لئے بہت کچھ کام کیا ہے۔ مدراس کے موجودہ شعراء میں زیادہ تعداد مولانا کے شاگردوں کی ہے اور شاعری میں آپ کی نمایاں حیثیت ہے۔ ہندستان کے بلند پایہ اُردو رسالوں میں آپ کا کلام اور مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ علاقۂ مدراس صحافتی میدان میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ چنانچہ سب سے پہلا اخبار عمدۃ الاخبار کے نام سے شایع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ اُردو بابتہ اپریل ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا ہے اعظم الاخبار کو جنوبی ہند کا پہلا اخبار بتلایا ہے جو ۱۸۴۸ء میں مدراس سے جاری ہوا تھا۔ مولوی محمد سعید عبدالخالق صاحب جنھوں نے "میسور میں اُردو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شایع کی ہے اپنا ایک مضمون "جنوبی ہند کا پہلا اخبار" رسالۂ سب رس میں اشاعت کے لئے روانہ کیا ہے۔ اس مضمون میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ میں نے مسلم لائبریری (معسکر بنگلور) میں جامع الاخبار کی قدیم جلد دیکھی۔ یہ مولوی عبدالرحمن صاحب فیضی مالک فیض عام الکٹرک پریس نے لائبریری کو تحفہ دیا ہے۔ اس اخبار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اجرائی ۱۸۴۰ء میں عمل میں آئی۔ اس طرح یہ جنوبی ہند کا پہلا اور دنیائے اُردو کا تیسرا اخبار ہے۔ حسن اتفاق سے اس اخبار کی ایک جلد ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس میں اکتوبر ۱۸۵۳ء سے لیکر ستمبر ۱۸۵۴ء تک کے اخبار موجود ہیں۔ یہ اخبار بڑی تختی کے آٹھ صفحات پر دو کالم میں ہفتے میں ایک بار پیر کے روز مدراس کی مونٹ روڈ پر بہرام جنگ بہادر مرحوم کے باغ کی پہلی گلی کے چھاپے خانہ میں طبع ہوتا تھا۔ اخبار کے آخری صفحہ پر المشتہر سید رحمت اللہ لکھا ہوا ہے۔ غرض

مدراس سے تقریباً پندرہ ہفتہ وار۔ پانچ روزنامے۔ چار ماہوار۔ اور ایک سہ ماہی رسالہ شایع ہوتا تھا۔ ان میں سے سہیل، مصحف۔ اور جلوۂ سخن۔ آخری دور کے ہیں۔

مدراس میں مختلف انجمنیں بھی اُردو کے کام میں لگی ہوئی ہیں لیکن اب تک ان کا کوئی عملی کام منظرِ عام پر نہ آیا۔ توقع ہے کہ یہ انجمنیں اجتماعی طور پر اُردو ادب کی ٹھوس خدمات انجام دیں گی۔ میسور میں اُردو کی ابتداء غالباً ۱۴۰۰ء سے شروع ہوئی۔ اور ۱۴۶۵ء میں یہاں اُردو بولنے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ۹۹۷ھ کی اُردو نثر کی ایک کتاب مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے یہاں محفوظ ہے۔ جو فارسی کتاب تنبیہ الغافلین کا اُردو ترجمہ ہے۔ صاحب موصوف کے پاس ۱۱۰۰ھ کی ایک منظوم کتاب "ہزار مسائل" بھی ہے جس کی زبان قدیم دکھنی ہے۔ ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۹ء تک اُردو کے کئی شاعر میسور میں پیدا ہوئے۔ ٹیپو سلطان کے عہد میں اُردو کو خوب ترقی ہوئی۔ اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ٹیپو سلطان کی اُردو سرپرستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے زین العابدین خاں سے ایسے اُردو گیت لکھوائے جو فوجی باجے کے ساتھ گائے جا سکیں۔ اور یہ اختراع ٹیپو سلطان کی بیدار مغزی کا بین ثبوت ہے۔

۱۷۹۹ء سے میسور میں عہد راجگان کا آغاز ہوتا ہے۔ ہز ہائنس مہاراجہ آنجہانی کو اُردو فارسی سے خاص شغف تھا۔ اور ان دونوں زبانوں میں نوشت وخواند کی کافی قابلیت رکھتے تھے۔ موجودہ حکمران ہز ہائنس مہاراجہ میسور کو بھی اُردو زبان سے گہری دلچسپی ہے۔ بچپن میں آپ نے اُردو کی تعلیم پائی۔ اور اس پر کافی عبور حاصل کیا۔ حکومت میسور کی جانب سے تقریباً ایک ہزار تحتانوی اور وسطانوی مدارس قائم ہیں۔ جامعۂ میسور میں اُردو کا شعبہ قائم ہے۔ چند ماہ قبل حکومت نے اُردو، فارسی اور عربی کی صدارت کے لئے ایک اُردو پروفیسر کے تقرر کا فیصلہ کیا۔ اور اس پر جامعۂ عثمانیہ کے ایک لائق فرزند پروفیسر مولوی عبدالقادر صاحب سروری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس واقعہ سے اس بات کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے کہ ریاست میسور کو اس مشترکہ زبان کی ترقی کا جو ہندو مسلم اتحاد کی واحد یادگار ہے کتنا بڑا خیال ہے۔

اس دور میں میسور میں کئی نامی گرامی شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے خاموش طریقے پر اپنی زبان کی خدمات انجام دیں۔ ایک عرصہ تک اُردو دنیا ان کے کارناموں سے ناواقف رہی لیکن چند روز قبل "میسور میں اُردو" کے نام سے ایک کتاب میری نظر سے گزری جس میں لائق مرتب نے میسور کے تمام شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام یک جا کر دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے میسور میں اُردو کے نشو و نما کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس تذکرہ میں بیسیوں شعرا اور ادبا کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کے نمونے درج ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں ان کی تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ میسور اور بنگلور اُردو کی خدمت گزاری سے غافل نہیں۔ بلکہ آئے دن نئے نئے رسالے یہاں سے جاری ہوتے رہتے ہیں۔ اور علم و ادب کی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ رسالوں میں فانوس اور آزاد اُردو و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انجمنوں میں شاخ نسواں ادارۂ ادبیات اُردو بنگلور بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جو محترمہ عقیلہ مکی بیگم صاحبہ کی صدارت اور محترمہ حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم۔ اے کی معتمدی میں اُردو و ادب کی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ اور بنگلور کی خواتین میں اُردو ادب کا ذوق عام کرنے کی ان تھک کوشش کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس انجمن نے ان پڑھ خواتین کو اُردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے کام کو بھی اپنے ذمے لے لیا ہے۔

آخر میں اس تمنا کے ساتھ میں آپ حضرات سے رخصت ہوتا ہوں کہ آپ کی یہ کانفرنس اُردو کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اور اہل میسور کے دلوں میں اُردو کی خدمت گزاری کے جذبات کو موجزن کردے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد
متعلم ایم۔ اے (آخری)

عُرفی پر ایک اجمالی نظر

عرفی کا اصلی نام محمد اور اس کا لقب جمال الدین تھا۔ اس کے والد کا نام زین العابدین تھا۔ عرفی فطرتاً مغرور اور خودستا واقع ہوا تھا۔ اپنے حسب و نسب پر اکثر فخر کیا کرتا تھا۔ عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی۔ شاہ نواز خاں (مصنف مآثر الامراء) نے تذکرہ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی نے علاوہ معمولی علوم کے مصوری و نقاشی کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ فنون لطیفہ سے اس کو فطری لگاؤ تھا۔ سلطنت صفویہ میں شعر و شاعری کو خاص طور پر عروج حاصل ہوا۔ تمام ملک شعر و سخن کی زمزمہ سنجیوں کا مرکز تھا۔ اس زمانے میں محتشم کاشی، وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ جیسے شعراء تھے جو فغانی کی طرز پر شعر کہتے تھے۔ ان تمام حالات اور ایسے ماحول سے کسی شاعر کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ عرفی نے بھی جس کو فطرت نے ذوق سخن عطا کیا تھا، فغانی کی طرحوں پر شعر کہنا شروع کیا جس کی وجہ سے اس کے شعری ذوق کو تقویت حاصل ہوئی۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ شاعر کی اگر حقیقی معنیٰ میں قدر کی جائے تو وہ خوش ہوتا ہے اور جہاں اس کی حوصلہ افزائی یا قدر دانی نہ ہو تو وہ احساس کمتری سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی فطری صلاحیتوں کا خون ہوتا ہے۔ خطۂ ایران میں عرفی کی قدر دانی جیسی کہ ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی اسی لئے وہ اپنے ہم عصر لوگوں سے شاکی تھا۔ جب وہاں قدر دانی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو اس نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں شاعروں کی قدر دانی خاص طور پر کی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر قدر دانی کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ شاعروں کو زر و جواہر میں تول دیا جاتا تھا۔ عرفی اس قدر دانی کا شہرہ سُن کر ہندوستان آیا لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے آنے کا اصل سبب شہزادہ سلیم

کے ساتھ اس کا غائبانہ عشق تھا۔

بہرکیف وہ ہندستان آیا، راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کا سارا اثاثہ جاتا رہا اس پر اس نے ایک رباعی لکھی۔

دوشینہ کہ بردبرد وشم بود زانو چو عروس نود رآغوشم بود
پوشیدنی نہ داشتم غیر از چشم چیزے کہ برسرہم گوشم بود

ہندوستان آکر اپنے مذاق کے مطابق فیضی کو رفاقت کے لئے منتخب کیا۔ عرفی فتح پورسیکری میں فیضی سے ملا اور فیضی نے اس کی پوری قدردانی کی۔ لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے محبت نبھ نہ سکی جس کی وجہ سے دربار سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

اس زمانے میں دربار اکبری کے نورتن مشہور تھے جن میں حکیم ابوالفتح گیلانی بھی تھا۔ حکیم اگرچہ منصب واقتدار کے باعث سب سے کم درجہ رکھتا تھا لیکن علم وفضل کے باعث اس کو سب پر ترجیح حاصل تھی۔ اس کے علاوہ حکیم بڑا نکتہ شناس اور نقادفن تھا اسی سبب سے عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بہت ترقی کی۔ عرفی نے حکیم کی مدح میں بہت سے بلند پایہ قصیدے لکھے ہیں جن میں اس کے علم وتبحر کا اعتراف کیا ہے۔ حکیم کی فرمایش پر عرفی نے خان خاناں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے۔

اے داشتہ درسایۂ ہم تیغ وقلم را وی ساختہ آرایش ہم فضل وکرم را

وہ خانخاناں کے درباریوں میں داخل ہوگیا اور پھر کبھی کسی شاہی خاندان کے آستانہ پر سر نہیں جھکایا۔ خانخاناں نے عرفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو فیاضیاں کی ہیں اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدہ پر ستر ہزار روپیے انعام دلوائے۔

وفات تذکرۂ داغستانی میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اس کو زہر دے کر مارا اور اس کی وجہ

یہ بیان کی گئی ہے کہ شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا اظہار کرتا تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر چھتیس[۳۶] سال کی تھی۔ اس کی تاریخ وفات "عرفی بجواں مرگ شدی" سے نکلتی ہے۔ اسی تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ عرفی کو لاہور میں دفن کیا گیا اور چند دن کے بعد کوئی فقیر اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف لے گیا۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ملا عبدالباقی جو عرفی کا ہم عصر تھا، مآثر رحیمی میں لکھتا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا درباری تھا اس نے ایک قلندر کو کثیر رقم دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے نجف لے جائے۔ غرضکہ عرفی کی یہ پیشینگوئی صحیح نکلی کہ

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم اگر بہ ہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

اخلاق و عادات

عرفی کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ فخر، غرور اور خودستائی ہے۔ اس کی نخوت پرستی کی وجہ سے اس کے تمام ہم عصر اس سے نالاں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ نظیری جیسے بلند پایہ شاعر سے بھی رہا نہ گیا چنانچہ وہ عرفی کے انتقال کے بعد ایک قصیدہ میں لکھتا ہے کہ

دریں قصیدہ بہ گستاخی ارچہ عرفی گفت بداغ رشک پس از مرگ سوخت خاقانی

کنوں بہ گور چناں او بہ رشک می سوزد کہ در تنور تواں گوسفند بریانی

عرفی نہایت حاضر جواب اور ظریف واقع ہوا تھا۔ ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پر ملنے گیا تو ابوالفضل کو قلم دانتوں میں پکڑے ہوئے پایا۔ اس وقت ابوالفضل کسی سوچ میں منہمک تھا۔ عرفی نے غور و فکر کا سبب پوچھا۔ ابوالفضل نے کہا "بھائی صاحب کی بے نقط تفسیر کا دیباچہ لکھ رہا ہوں۔ ایک موقع پر والد کا نام "مبارک" آگیا ہے چاہتا ہوں کہ نام ایسا آئے کہ وہ بھی بے نقط ہو۔" عرفی نے فوراً کہا کہ کونسی بڑی بات ہے اپنے لہجہ میں "مارک" لکھ دیجئے (ابوالفضل کی زبان میں لکنت تھی اور وہ صاف طور پر گفتگو نہیں کرسکتا تھا)۔

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا، عرفی اس کی عیادت کو گیا۔ فیضی کو کتوں کے پرورش کرنے کا بہت شوق تھا! اس موقع پر کتے کا ایک بچہ گلے میں سونے کا پٹہ ڈالے پھر رہا تھا۔ عرفی نے کہا "مخدوم زادہا چہ نام دارد"۔ فیضی نے کہا "عرفی" اس کے جواب میں عرفی نے کہا "مبارک باشد"

تصانیف

عرفی نے حسب ذیل تصانیف لکھی ہیں :۔

(۱) نفسیہ۔ اس میں تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور نفس کے متعلق اہم امور کی تفصیل پر توجہ کی گئی ہے۔ (۲) کلیات قصاید و غزلیات۔ جس کو محمد قاسم نے مرتب کیا تھا لیکن یہ نسخہ اب نایاب ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں نے محمد قاسم کو دیوان کی ترتیب پر مامور کیا تھا! اس کے علاوہ دو مثنویاں ہیں جو علی الترتیب مخزن اسرار اور شیریں خسرو کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔

خصوصیات کلام

اس بات پر سب متفق ہیں کہ اصناف سخن میں سے عرفی مثنویوں پر زیادہ قادر نہیں تھا جیسا کہ اس کے ایک خاص معتقد نے بھی تسلیم کیا ہے

مثنویش رنگ فصاحت نداشت کان نمک بود ملاحت نداشت

عرفی کی شاعری کی شہرت اس کے بلند پایہ قصیدوں کی وجہ سے ہے۔ عرفی کو اپنے قصیدوں پر بہت ناز تھا اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میرا قصیدہ کسی غلط خواں سے نہ پڑھوا جائے ورنہ میرا بھی وہی حال ہوگا جو کمال اسماعیل کا ہوا تھا"۔ عرفی کا شہرہ سن کر جہانگیر نے اس کو دربار میں بلایا اور اس سے قصیدہ کی خواہش کی۔ عرفی نے ہمہ تن شوق و بیتابی کے عالم میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔ صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

اس کے کلام کی شہرت کو بیان کرتے ہوئے ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں کتب فروش بیچتے پھرتے تھے اور اہل عراق تبرکاً خریدتے تھے۔ عرفی کے کلام میں

زور بیان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ کلام میں الفاظ کی شان وشوکت بندش کی چستی، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت، اور مضامین کا زور اور تسلسل موجود ہے

اس نے متعدد جگہ نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کئے ہیں جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاصہ اثر پڑتا ہے مثلاً

خیز دشراب جبرتم زاں قدجلوہ ساز دہ روی بروی حسن کن دست بدست ناز دہ

مرحبا اے زعنایات ازل رمز فروش مرحبا اے بہ علامات ہنر خویش ستائے

بہ برقعہ مہ کنعاں کہ بود حسن آباد بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار

اس کے استعارات کی جدت اور تنوع نے ایوان شاعری میں گوناگوں نقش و نگار کا کام کیا ہے۔ عرفی کے تخیل کی بلندی اور فصاحت و بلاغت کا زور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصیدوں میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔ کلام میں تخیل کے ساتھ ساتھ ربط اور ترتیب کا خاص طور پر لحاظ رکھتا ہے اس میں مطلق شبہہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی قوت تخیل حد درجہ بلند تھی۔ جہاں لوگوں نے عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کی ستایش کی ہے وہاں اس کی قوت تخیل کا حقیقی معنیٰ میں اعتراف کیا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اس کی قوت تخیل کو دیکھ کر کیا خوب کہا ہے کہ

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

ذیل کے اشعار اس کی قوت تخیل اور جدت ادا کے شاہد ہیں

زہرہ گیسو بکشاید وشود گرد فشاں از زکابش کہ پذیرفتہ از تنگ وتاز

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود از در گوش سراسیمہ بلب گرد د باز

مہتاب گل از ہم بشگافد قصب شاخ وز لمعۂ او سیب قمر لعل تر آید

عرفی ایک طرف اگر نکتہ سنج، نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا تو دوسری طرف

شباب میں نہایت خوش اور حسین لوگوں کا منظور نظر تھا۔ وہ کہیں عشق حقیقی کے اسرار اور دقایق بیان کرتا ہے اور کہیں عشق مجازی میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں ان کو پیش کرتا ہے۔ دیدار میں عاشق ہر وقت نظارہ میں محو ہوتا ہے اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے

چگونہ مانع نظارہ ام شوی کہ مرا زشوق روی تو سرتاقدم نگہ خیز است

جوش حسن میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معشوق آئینہ دیکھ کر خود اپنے آپ کو چاہنے لگتا ہے اس حالت کو اس شعر میں کتنے لطیف انداز میں بیان کرتا ہے کہ داد دیے بغیر رہا نہیں جاتا

دہن خویش ببوسند ولب خویش گزند چو در آئینہ ببینند بتاں صورت خویش

ابتدائے عشق میں عاشق کو بہت سی مصیبتوں، تکلیفوں اور درد و سوز میں مبتلا ہونا پڑتا ہے کہتا ہے

عشق می گویم و می گریم زار طفل نادانم و اول سبق است

عشق میں عقل و ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ عاشق پر دیوانگی کی حالت طاری ہوتی ہے اس وقت واعظ کی نصیحتیں اور اس کی عالمانہ گفتگو اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔

گفتگو ہائے حکیمانہ نیالاید عشق بگذارید کہ این نکتہ مسلم باشد

حسن کی رونق عشق سے اور عشق کی حسن سے ہے۔

ایں صفا حسن و محبت بہم اندوختہ اند ایں دو شمع است کہ از یکدگر افروختہ اند

بہرکیف اس نے عشق کے متعلق مختلف گہرے خیالات اور حقایق بیان کئے ہیں، اور عشق کے رموز و نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے کلام میں اکثر جگہ اخلاقی اور نفسیاتی مسائل بھی بیان کئے ہیں جن کا یہاں پر ذکر کرنا باعث طوالت ہے۔

محمد مصلح الدین صدیقی متعلم بی۔ اے (ابتدائی)

سوویٹ جمہوریت میں انسانی حقوق

سنہ ۱۹۳۶ء کا دستور سوویٹ روس کے سیاسی و معاشی ارتقاء میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کی رو سے انسانی حقوق کی نئی تشریح اور نئی تعبیر کی گئی ہے۔ انسان کا حق حیات، حق آزادی، حق اجتماع، حق تقریر و تحریر ان تمام حقوق کو نئے رنگ اور نئے طریقہ سے پیش کیا گیا ہے Beatruce webb Sidney and نے انہیں "انسانی حقوق کی نئی ساخت" کہا ہے ۔ قدیم جاگیرداری نظام میں انسانی حقوق کا کوئی خاص تخیل موجود نہ تھا مختلف معاشری طبقات کے مختلف حقوق تھے امراء اور مذہبی پیشواؤں کو سب سے زیادہ حقوق حاصل تھے اور عام شہریوں کو بہت ہی کم حقوق حاصل تھے عام شہریوں میں بھی حقوق کا کوئی ایک مقررہ معیار نہیں تھا کاشتکاروں کو جو تیسری صف میں شمار کئے جاتے تھے بہ صحیح معنی میں حقوق حاصل تھے ہی نہیں کیونکہ زمینداروں کو ان پر پورے اختیارات حاصل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پہلی بار حقوق کا تخیل پیدا ہوا امریکہ کے اعلان آزادی اور انقلاب فرانس کے "شہریوں اور انسانوں کے حقوق کے اعلان" میں افراد کے ناقابل انتقال حقوق حیات اور آزادی کا اعلان کیا گیا۔ مساوات کے معنی اس نظام میں "قانون کے آگے مساوات" کے تھے لیکن لاسکی کے الفاظ میں "قانون معاشرہ کے طبقاتی رشتوں سے غیر جانبدار نہیں ہوسکتا اور سرمایہ دارانہ نظام میں قانون کی افادیت یہی ہے کہ وہ معاشرہ کے طبقاتی رشتوں کے استحکام و بقاء کی ضمانت ہے۔ اس لحاظ سے سرمایہ دارانہ معاشرہ میں "مساوات" کوئی اصلی اور حقیقی مفہوم پیدا نہیں کرسکتی۔ قانون کے آگے مساوات "مساوی مواقع موجودگی میں حقیقی معنی نہیں رکھتی"

سرمایہ دارانہ جمہوریت میں مساوی حقوق حقیقی مفہوم کے حامل نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ لاسکی کے الفاظ میں "وہ جبر جو افلاس اور بے روزگاری میں پوشیدہ ہے۔ وہ مساوی حقوق کی اصطلاح کو مضحکہ خیز بنادیتا ہے"

بے روزگاری افلاس اور جہالت کی موجودگی میں حقوق اصلی معنی نہیں حاصل کر سکتے " اخلاقی ترقی " جو ارسطو کے خیال میں انسان کے لئے " خیر برتر " ہے اور جس کا حصول گرین کے نقطۂ نظر سے بغیر " حقوق " کے نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی معنی نہیں رکھتی نہ صرف مادی ترقی بلکہ اخلاقی اور روحانی ترقی کے دروازے بھی پست طبقات کے لئے بند ہیں اور جمہوریت بھی جو مساوات آزادی کا دوسرا نام ہے اس نظام میں حقیقی معنی حاصل نہیں کر سکتی۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ایک ایسا دور آتا ہے جب وہ اور انسانی آزادی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اس وقت یا تو انسانی ازادی کا انتخاب کرنا ہوتا ہے یا سرمایہ داری کا سوویٹ روس نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ بجائے انسانی آزادی اور مساوات کے ختم کرنے کے اس نے سرمایہ داری اور عدم مساوات کے سارے ذرایع کو ختم کیا اس طرح جمہوریت کے لئے راستہ پیدا کیا کیونکہ جمہوریت کے لئے جیسا کہ لاسکی کا خیال ہے " نہ صرف سیاسی مساوات بلکہ معاشری مساوات بھی ضروری ہے۔ اسٹالن نے رائے ہوورڈ (امریکن جرنلسٹ) سے ملاقات کے دوران میں کہا تھا کہ " صرف اشتراکی معاشرہ میں ہی حقیقی آزادی پائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ آزادی کے لئے استحصال کا خاتمہ ضروری ہے۔ ہم اس معاشرہ کی تعمیر شخصی آزادی کی تحدید کے لئے نہیں بلکہ فرد کو صحیح معنی میں آزاد بنانے کے لئے کرتے ہیں "

اخلاقی زندگی اور اخلاقی ترقی کے لئے معاشرہ کا وجود ضروری ہے۔ معاشرہ ہی میں انسانی اخلاق ترقی کر سکتا ہے۔ اخلاقی ترقی صرف اندرونی یا باطنی شئے نہیں بلکہ خارجی حالات کا بھی اس پر اثر پڑتا ہے اس لئے گرین نے کہا تھا کہ " مملکت کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی ترقی کے موانعات کو دور کرے " سوال یہ ہے کہ اخلاقی اور روحانی ترقی میں موانعات کیا ہو سکتے ہیں اور کن انسانی ضروریات کی فراہمی کے بعد ہی یہ ترقی ممکن ہے۔ انیگلز نے کہا تھا کہ " اس سے پہلے کہ انسان اپنی توجہ سیاسیات۔ سائنس۔ آرٹ اور مذہب کی طرف منعطف کرے۔ یہ ضروری ہے کہ ان کی مادی ضروریات جیسے غذا، لباس اور مکان وغیرہ کی تکمیل ہو " انیگلز کا یہ خیال غیر حقیقی نظر نہیں آتا کیونکہ افلاس غربت اور مادی پریشانیوں میں گھرا ہوا کوئی فرد بھی اخلاقی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے سب سے پہلا اور ضروری حق انسان کے لئے " کام کرنے کا ہے " Right to work جو سوویٹ روس کے مشہور ماہر

قانون "کرا ے لن کو" Krylenko کے الفاظ میں ایسا بنیادی حق ہے جو تمام دوسرے حقوق کی ضمانت کرتا ہے" سرمایہ دارانہ نظام اس حق کی کوئی ضمانت نہیں دیتا۔ بے روزگاری اس نظام کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سوویٹ روس نے ۱۹۳۶ء کے دستور سے افراد کے اس حق کی ضمانت دی ہے کہ "سوویٹ روس کے شہری کام کرنے اور کام کی کمیت وکیفیت کی مناسبت سے معاوضہ پانے کا حق رکھتے ہیں ان کا یہ حق وسایل دولت کی قومی تنظیم اور سوویٹ معاشرہ کی دولت آفرینی کی قوتوں میں مسلسل ترقی اور معاشی بحران کے امکانات کے ختم کر دئے جانے اور بے روزگاری کے انسداد کی وجہ سے محفوظ کیا گیا ہے" بے روزگاری کا مسئلہ عرصہ ہوا روس میں خارج از بحث ہو گیا ہے۔ ۱۹۳۱ء ہی میں روس میں بے روزگاری کا کامل خاتمہ ہو چکا تھا - اس طرح روس میں ایک ضروری اور بنیادی حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ جس کے بغیر افراد کی روحانی معاشری اور اخلاقی ترقی تقریباً ناممکن ہے۔

معاشری اخلاقی ترقی کے لئے افراد کے لئے فرصت اور آرام کی بھی ضرورت ہے ایسا آرام نہیں جو بے روزگاری کی وجہ سے حاصل ہوتا ہو اور نہ ایسا آرام اور ایسی فرصت جو صرف استحصال سے حاصل ہوتی ہے بلکہ کام کرنے کے بعد آرام کیونکہ بے روزگاری میں اخلاقی وروحانی ترقی ناممکن ہے اور دوسری صورت میں استحصال خود ایک غیر اخلاقی اصول ہے کیونکہ اس میں ایک اخلاقی اصول کہ "ہر شخص بجائے خود مقصد ہے نہ کہ ذریعہ" ختم ہو جاتا ہے۔

روس کے دستور میں اس حق کی بھی ضمانت دی گئی ہے "حق آرام کی، اوقات کار بجائے ۸ گھنٹہ کے ۷ گھنٹہ مقرر کرنے سے ہر سال اجرت کے ساتھ تعطیلات دارالصحت (Sanitoria) آرام گھر اور کلب وغیرہ کے ذریعہ ضمانت کی جاتی ہے"

معاشرہ کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے اچھی صحت ناگزیر ہے۔ روس میں طبی امداد کا بڑے پیمانہ پر نہایت معقول انتظام کیا گیا ہے اور متعدد صحت گھر تعمیر کئے گئے ہیں۔

کبرسنی۔ بیماری یا عدم صلاحیت کی صورت میں مادی اور معاشی صیانت کے حق کو بھی قانوناً تسلیم کیا گیا۔ مزدوروں اور دوسرے ملازمین کے لئے

مفت طبی امداد اور صحت گھروں کے ذریعہ اس حق کو عملی صورت دی گئی۔ ایسے افراد جو قدرتاً
کام کرنے اور معاشری ذمہ داریوں کی تکمیل سے قاصر ہوں معاشرہ کی ان پر ذمہ داری ہے سوویٹ
روس میں اس ذمہ داری کی تکمیل پوری طرح کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء تک تقریباً (۵۰۰۰) اندھوں
اور (۴۰۰۰) گونگوں کو اس قابل بنایا گیا تھا کہ وہ کارخانوں وغیرہ میں مختلف کام کرسکیں۔ حق تعلیم افراد
کے اہم ترین حقوق میں سے ایک ہے۔ سوویٹ روس کے دستور اساسی میں ابتدائی تعلیم کو جبری قرار
دینے اور جبری واعلیٰ تعلیم کو مفت قرار دینے سے اور وظائف وغیرہ کے طریقہ سے اور زمانہ تعلیم میں
ہر قسم کی مادی امداد کے ذریعہ سے اس حق کی بھی ضمانت کی گئی ہے۔ ان تمام حقوق کی جو حق حیات کا
لازمی نتیجہ ہیں یعنی کام کرنے کا حق حق آرام عدم صلاحیت اور کبر سنی میں حق امداد اور حق تعلیم کی ضمانت
صرف ایک ایسے معاشرہ میں ہی ہوسکتی ہے جس میں ذرایع پیداوار اور معاشی قوتوں کے مالک افراد
نہ ہوں اور جہاں استحصال کا خاتمہ کر دیا گیا ہو یعنی جہاں "اشتراکی نظام معیشت" ہو اور روس کے تجربہ
نے اس کو شک وشبہ کی منزلوں سے بالاتر کرکے ایک حقیقت بنا دیا ہے۔

مساوات ——

مساوات جمہوری اخلاق کا ایک ضروری جزء ہے لیکن سرمایہ دارانہ جمہوریت میں
یہ اخلاقی اصول صرف رائے دہی کی مساوات اور "قانون" کے آگے مساوات سے زیادہ عملی حقیقت
حاصل نہ کرسکا۔ جیسا کہ لاسکی نے بتایا ہے کہ سیاسی مساوات بغیر معاشی اور معاشری مساوات کے پوری
طرح حقیقی نہیں کہلائی جاسکتی۔

سوویٹ روس کے دستور میں اس سے کہیں زیادہ حقیقی مساوات کی ضمانت دی گئی ہے۔
دستور کے فقرہ ۱۲۳ میں اس حق کی اس طرح تشریح کی گئی ہے۔ "سوویٹ یونین کے تمام شہریوں کی بلالحاظ
اختلاف قومیت اور نسل معاشی ملکی تہذیبی معاشری اور سیاسی زندگی میں مساوات ناقابل تنسیخ قانون
ہے۔ ان حقوق کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تحدید یا شہریوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی نسل یا قومیت
کی بنا پر کسی خاص استثنائی حق عطا کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ نسلی یا قومی امتیازات کا پرچار۔

(نفرت اور حقارت کی صورت میں) قانون کے ذریعہ سزا دی جائے گی

شہریوں کے مساوات کی اس حد تک تسلیم جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کسی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ "مساوات" بغیر مواقع کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اور سوویٹ روس نے تمام ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت قرار دے کر مساوی مواقع پوری طرح فراہم کر دئے ہیں اس فقرہ میں ایک اہم اخلاقی اصول کہ قومیت نسل اور اس قسم کے دیگر اختلافات کی بناء پر تفوق کو ختم کیا جائے پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ ان تحدیدات کی بھی نسل اور قومی امتیازات اور تفوق موجودگی میں "مساوات" کا حق بہت زیادہ حقیقی نہیں بن سکتا۔ سوویٹ روس میں نہ صرف معاشی امتیازات کی بلکہ اس کے ساتھ تہذیبی معاشری اور نسلی امتیازات کی بیخ کنی کر دی گئی ہے۔ کیونکہ بڑی حد تک نسلی تہذیبی اور قومی امتیازات معاشی محکومیت اور استحصال سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ایک انگریز سامراج پرست جنوبی افریقہ کی نوآبادی میں اپنے آپ کو تہذیبی حیثیت سے برتر تصور کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی تہہ میں اس کی سامراج پرستی ہے معاشی محکومیت تہذیبی محکومیت بھی پیدا کرتی ہے لیکن اگر معاشی محکومیت کو ختم کر دیا جائے گا تو تہذیبی محکومیت بھی بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ سوویٹ روس میں نہ صرف افراد کی سیاسی مساوات بلکہ قومیتوں کی بھی سیاسی اور تہذیبی مساوات کو تسلیم کیا گیا ہے اور قومیتوں کا حق خود ارادیت جو بین الاقوامی اخلاق کا ایک ضروری اصول ہے۔ یہاں بڑی حد تک حل کر دیا گیا ہے۔ مختلف قومیتوں کو حق خود ارادیت اور خاص حالات کی مناسبت سے سوویٹ یونین (U. S. S. R.) کے دستور کی مطابقت میں اپنا دستور آپ وضع کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یونین سے علحدگی کی آزادی بھی ہر ریاست کو دی گئی ہے۔ قومیتوں کا حق خود ارادیت اور علحدگی جمہوریت کا لازمی اصول ہونا چاہیے کیونکہ جمہوریت حقیقی معنی میں اسی حق کا نام ہے صرف معاشی محکومیت اور استحصال کے خاتمہ نے یہ ممکن کیا کہ قومیتوں کے اس حق کو پوری طرح تسلیم کیا جائے کیونکہ اب ان مختلف ریاستوں کے باہم اتحاد کا محرک صرف جذبہ ہمسازی (Co-operaiion) ہے کوئی معاشی محکومیت نہیں۔ لیکن صنعت کی ترقی نے ساری دنیا کی اقوام کو ایک دوسرے سے متحد اور منسلک کر دیا ہے اور اب قوموں کے علحدگی پسند رجحانات زمانہ کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے اور نہ یہ ممکن ہے۔ اس لئے قوموں کا باہمی

تعاون عمل اب ایک معاشی ضرورت بن گیا ہے لیکن یہ باہمی تعاون عمل آزاد اقوام میں ہی ہو سکتا ہے تعاون عمل کے لئے آزاد ارادہ کی ضرورت ہے اور سوویٹ روس کے دستور میں قومیتوں کے اس حق کی پوری ضمانت دی گئی ہے۔ ہر قوم کی ایک ایک فطری قابلیت (Genius) ہوتی ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ انہیں اپنی وضع پر آپ ترقی کرنے کا اختیار اور حق حاصل ہو ان کے کلچر اور تہذیب کی ترقی کے لئے آزادی ہو لیکن۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ معاشی اور سیاسی محکومیت کا وجود نہ ہو۔ اور اسی صورت میں اقوام کے درمیان باہمی تعاون عمل پیدا ہو سکتا ہے لینن نے بہت ہی پہلے اس کی اہمیت کو محسوس کیا تھا چنانچہ ۱۹۰۳ء ہی میں روس کی کمیونسٹ پارٹی نے لینن کی رہنمائی میں اقوام کے حق خود ارادیت کی حمایت کی اور اعلان کیا کہ ان کو حق خود ارادیت حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ انقلاب کے بعد اس فیصلہ کے مطابق لینن نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اعلان نامہ شایع کیا جس میں اس نے کہا کہ "جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں زار کے زمانہ میں برباد کی جاتی تھیں جن کے رسم و رواج روس کے ظالم حاکموں کے پیر تلے کچلے جاتے تھے تمہارے عقیدے اور رسم و رواج تمہارے قومی ادارے اور تہذیب اب سے آزاد ہیں اور ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی تمھیں انہیں برتنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تمھیں معلوم ہو کہ تمہارے حقوق کو اور روس میں رہنے والی تمام قوموں کے حقوق کو انقلاب کی اور مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کی سوئیتوں (Soviets) کی زبردست محافظت حاصل ہے۔"

۱۹۳۶ء کے دستور میں انہیں اعلانات کی مطابقت اور سوویٹ روس کی قدیم پالیسی کے مطابق اقوام کے اس حق کو تسلیم کیا گیا۔ موجودہ سیاسی پیچیدگیوں کا قومیتوں کا مسئلہ بھی ایک سبب ہے چنانچہ ہندوستان کے سیاسی تعطل اور سیاسی پیچیدگی کا ایک سبب یہی مسئلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بغیر اس حق کو تسلیم کئے اس تعاون عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی جو معاشرہ کی اخلاقی روحانی اور معاشری ترقی کے لئے ضروری ہے۔ روس کی اس پالیسی کا ہی نتیجہ ہے کہ روس اس عظیم جنگ میں اتنی عظیم الشان مزاحمت کر رہا ہے۔ اور تمام قومیتیں کامل اتحاد کے ساتھ برسر جنگ ہیں۔ افراد کی مساوات

اور اقوام کی مساوات کے علاوہ جنسی مساوات بھی جمہوریت کا ایک ضروری اصول ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ کی کشمکش کے بعد امریکہ میں عورتوں کو رائے دہی کے مساوی حقوق حاصل ہوئے۔ سوویٹ روس میں دستور کی رو سے "عورتوں کو معاشی ملکی تہذیبی معاشری اور سیاسی معاملات میں مردوں کے ساتھ کامل مساوات حاصل ہے"

عورتوں کے اس حق کو زیادہ حقیقی بنانے کے لئے تمام مواقع اور خارجی اسباب بھی فراہم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ دستور کے اسی فقرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "عورتوں کے ان حقوق کو حقیقی بنانے کے لئے عورتوں کے لئے بھی کام کرنے معاوضے حاصل کرنے آرام تعلیم اور (Social Insurance) بیمہ ماں اور بچہ کی حفاظت، زمانہ حمل میں رخصت با دائی اجرت اور زچگی خانوں وغیرہ کے کثیر تعداد میں اہتمام کے ذریعہ ضمانت دی جاتی ہے"۔ کسی سرمایہ دار جمہوریت میں عورتوں کی مساوات اتنے وسیع معنی حاصل نہیں کرسکی کیونکہ اس کے لئے عورتوں کی خاص ضروریات کی فراہمی اوران کی معاشی آزادی ضروری ہے اور اس چیز کو سوویٹ روس کی عورتوں نے حاصل کرلیا ہے۔

انفرادی آزادی (Individual Liberty)

سوویٹ روس نے "حق حیات" (جس کی ضمانت کام کرنے کے حق آرام کے حق مادی آسائش اور حق تعلیم کے ذریعہ کی گئی تھی) اور حق مساوات کے ساتھ ساتھ حق آزادی کی ضمانت دی ہے۔ چنانچہ دستور میں فقرات ۱۲۴ تا ۱۲۹ میں اس حق کی تشریح کی گئی ہے۔

فقرہ ۱۲۴ میں آزادی ضمیر کی اس طرح تشریح کی گئی ہے "شہریوں کے لئے آزادی ضمیر کی ضمانت کے لئے سوویٹ یونین (U. S. S. R) میں کلیسا کو مملکت سے اور تعلیم کو کلیسا سے علحدہ کردیا جاتا ہے عبادت کی آزادی اور مخالف مذہب پرچار کی آزادی تمام شہریوں کے لئے تسلیم کی جاتی ہے"۔ اس طرح ضمیر کی آزادی کی حفاظت کی گئی کیونکہ کسی مذہبی مملکت (Theocracy) میں ضمیر کی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی اوراس کے لئے تعلیم کا بھی مذہبی اثرات سے آزاد ہونا ضروری ہے۔

فقرہ ۱۲۵ میں تقریر پریس اجتماع جلوس اور مظاہروں کی آزادی طباعت، کاغذ کی رسد پبلک

مقامات، سڑکیں، خبر رسانی اور آمدورفت کے ذرایع (Means of Communications)
اور دیگر مادی ضروریات کو مزدوروں اور ان کے اداروں کے اختیار میں دے کر قانوناً محفوظ کیا گیا ہے
سڈنی ویب (Sidney webb) کے الفاظ میں "عوامی آزادی کا یہ ایک بے نظیر اور انوکھا تخیل ہے"
سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی آزادی کے حق پر اشتمالیوں کی یہ تنقید تھی کہ اس نظام میں اظہار خیال
کی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں صرف اخبارات کے مالک ہی آزاد ہو سکتے
ہیں اور دوسروں کو صرف ان کی اجازت سے ہی اظہار خیال کا موقعہ مل سکتا ہے اس لئے ان کا
خیال ہے کہ صرف سوویٹ روس میں ہی آزادی خیال اور اظہار خیال کے پورے مواقع حاصل
ہو سکتے ہیں کیونکہ اظہار خیال کے تمام ذرایع معاشری اور اجتماعی ملک ہیں۔ اسی فقرہ میں یہ بھی صاف طور
پر واضح کیا گیا ہے کہ یہ آزادی "مزدوروں کے مفاد اور اشتراکی نظام کے استحکام کے مطابق ہے۔ کرائی لن
کو (Krylenko) نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کوئی مزدور کوئی کسان اور کوئی بھی
کارکن (Work person) اس پر اعتراض نہیں کرے گا کہ ان لوگوں کو جو سرمایہ داری کا احیاء چاہتے
ہیں انہیں آزادی تقریر یا پریس کی آزادی نہیں دی گئی"۔ اس حد تک تو یقیناً اظہار خیال پر پابندی ہے
لیکن یہ پابندی اشتراکی معاشرہ کی بقاء کے لئے جو مزدوروں کسانوں اور عوام کا معاشرہ ہے ضروری
ہے یعنی یہ پابندی عوام کے لئے اور معاشرہ کے مفاد کے لئے ضروری ہے جس طرح کہ اینگلز نے پہلے ہی
کہا تھا کہ کامل آزادی اور مملکت دو متضاد اصطلاحات ہیں کیونکہ مملکت میں کامل آزادی حاصل نہیں
ہو سکتی۔ سرمایہ دارانہ مملکت میں فرق صرف یہی ہے کہ اول الذکر مملکت میں چند افراد کے مفادات کو معاشرہ
کی اکثریت کے مفادات پر ترجیح حاصل ہوتی ہے اور آخر الذکر میں معاشرہ کی اکثریت کے مفادات
زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس لحاظ سے اشتراکی معاشرہ میں پوری
طرح آزادی اظہار خیال کا وجود نہیں یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن اگر جس طرح کہ لاسکی نے
بتایا ہے کہ امریکہ میں بعض پروفیسروں کو محض اس لئے کہ وہ انتہا پسند خیالات کے حامل ہیں برطرف
کر دیا جاتا ہے یا ان مزدوروں کو جو اشتراکیت کی حمایت کرتے ہیں کام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

تو اشتراکی مملکت میں ان لوگوں کے لئے اظہار خیال کی آزادی نہیں جو ایک ایسے معاشرہ کی تخریب کے در پے رہتے ہیں جس میں انفرادی نفع کے بجائے معاشرہ کے فایدہ کا محرک کام کرتا ہے۔ اس کو نقص تو کہا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی چیز پوری طرح مکمل ہوجائے تو پھر ارتقاء کہاں۔ ارتقاء غیر مکمل سے زیادہ مکمل کی طرف ہی تو ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ ایک عظیم ارتقاء تو ہے کہ اشتراکی روس میں معاشرہ کے ایک کثیر طبقہ کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ شہریوں کے اس حق کو بھی کہ "وہ اپنی عام تنظیموں (Public Organizations) میں مجتمع ہوں" فقرہ (۱۲۶) میں تسلیم کیا گیا ہے انالوی اسٹرانگ (Anna Louis Strong) نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کبھی بھی سرمایہ دارانہ مملکت کے دستور میں اس حق کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ سوویٹ روس میں ایسی تنظیمی اجتماع کے مقامات چھاپہ گھر اور اشاعت خانوں کی مالک ہوتی ہیں تاکہ افراد کو اظہار خیال کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ اس کے علاوہ افراد کی من مانے طریقوں سے گرفتاری بھی ممنوع قرار دی گئی ہے۔ (فقرہ ۱۲۷) اور ایسے بیرونی اشخاص کو جنھیں کسی علمی مشغلہ یا اس مقام کے مزدوروں کی تحریک سے متعلق ہونے یا قومی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی بناء پر نقصان پہونچایا جاتا ہو یا پریشان کیا جاتا ہو تو انہیں سوویٹ روس میں پناہ لینے کا حق (Right of Asylum) دیا گیا ہے۔

حقوق ۔ ایک منظم معاشرہ میں حقوق کے ساتھ فرائض بھی ضروری ہیں کیونکہ حقوق فرائض کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ روس کی اشتراکی مملکت میں دستور کی روسے "ہر شہری کا فرض ہے کہ سوویٹ یونین کے دستور کی پابندی کرے۔ قوانین کی تعمیل کرے اور مزدوروں کے نظم وضبط کو باقی رکھے پبلک فرائض (Publie Duties) کی دیانت داری سے تکمیل کرے اور اشتراکی معاشرہ کے معیارات کا احترام کرے۔ اسی طرح فقرہ (۱۳۱) کی روسے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اشتراکی مملکت کی سوویٹ نظام کی بنیاد وطن کی دولت اور قوت اور تمام شہریوں کی خوشحالی اور مہذب زندگی کا منبع ہونے کی حیثیت سے حفاظت کرے اور اسے مستحکم کرے سرمایہ دارانہ مملکت میں "ملکیت" کا احترام اور اس کی

حفاظت کی قانوناً ضمانت کی جاتی ہے اور لاک کے الفاظ میں مملکت کا فرض ہے کہ وہ افراد کی جایداد کی حفاظت کرے لیکن اشتراکی مملکت میں شہریوں سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جارہا ہے کہ چند افراد کی ذاتی جایدادوں کی حفاظت کریں اور ان کا احترام کریں اشتراکی معاشرہ میں عوامی دولت (Public Wealth) کی بربادی کے معنی عام مہذب اور خوشحال زندگی کے ذرایع کی بربادی کے ہیں۔ شروع شروع میں لوگوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کردیا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک اس کی اہمیت سے ناآشنا تھے اور اس سے بہت زیادہ اصراف بھی ہوتا تھا لیکن بعد میں ان میں جب معاشری تصور پیدا ہوا تو انھوں نے اس کی اہمیت کو جانا۔ اور اب توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل کی نسل جس کی خوشحالی کا دار ومدار اسی اجتماعی دولت پر ہے، اس اجتماعی دولت کی جبلی طریقہ سے حفاظت کرے گی جس طرح کہ ماضی میں ذاتی جایداد کی کی جاتی تھی اور یہی وہ منزل ہوگی جب قانون اور مملکت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور وہ غائب ہوجائیں گے" وطن کی مدافعت روس کے ہر شہری کا مقدس فرض ہے قانون کی رو سے یہی شہریوں کا فرض ہے۔ اشتراکیت جنگ پسند نہیں کرتی اس کی ترقی کے لئے عالمی امن ضروری ہے۔ اس جنگ کے آغاز سے قبل روس کے سابق وزیر خارجہ م، لیوٹوف M. Litowov نے "اجتماعی حفاظت" (Collective Security) کے لئے انتہائی کوشش کی تاکہ عالمی امن برقرار رکھا جائے اس نے اس پروگرام کے تحت ہمیشہ یہ کوشش کی کہ دیگر جمہوری ممالک سے اتحاد پیدا کرے تاکہ فسطائی سامراجی خطرہ سے تمام آزادی پسند اقوام کو نجات مل سکے لیکن سرمایہ دارانہ جمہوری ممالک نے اس پالیسی کو قبول نہیں کیا۔ روس کی اشتراکی مملکت کو ہمیشہ اس کا خطرہ لگا ہوا تھا کہ کسی وقت بھی دیگر سامراجی ممالک اس پر حملہ نہ کردیں۔ روس کا یہ خطرہ غلط نہیں تھا ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو اس خطرہ کی صداقت ظاہر ہوگئی جب کہ نازی جرمنی نے روس پر حملہ کردیا لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ کس طرح نازی جرمنی کو اپنی عزایم میں ناکامی ہورہی ہے اور روسی عوام پوری جانبازی کے ساتھ اپنے وطن کی اور اشتراکی مملکت کی مدافعت کررہے ہیں۔ چنانچہ جوزف ڈیوس جو ۳۸-۱۹۳۶ء تک ماسکو میں امریکی سفیر کی حیثیت سے رہ چکے تھے اپنی ڈایری میں لکھتے ہیں کہ " دنیا کی کسی حکومت نے لڑائی سے پہلے نازیوں کے

بڑھتے ہوئے خطرہ کو روکنے کی اتنی کوشش نہیں کی جتنی کہ سوویٹ یونین کی۔ لیکن جب برطانیہ اور فرانس کے رویہ نے ظاہر کر دیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہٹلر سوویٹ یونین پر حملہ کر دے تو کسی حکومت نے اس آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کی اتنی مکمل اسکیم تیار نہ کی جتنی اسٹالین اور سوویٹ حکومت نے کی۔ چنانچہ تیسرے پنج سالہ پروگرام کا مقصد یہی تھا کہ سرخ فوج کو ملک کی حفاظت کے لئے تیار کیا جائے۔

اس عظیم مدافعت کا راز یہی ہے کہ وہاں کے عوام باشعور طریقہ پر مدافعت کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے مفادات کی اپنی تہذیبی ادارات کی اور اس نظام کی مدافعت کر رہے ہیں جس نے انہیں خوشحالی تہذیب اور تمدن عطا کیا تھا۔ وہاں کے عوام کا جذبہ رفاقت اسی مدافعت کا اصلی راز ہے۔ جس کے متعلق کرائی لن کو (Krylenko) نے کہا کہ "سرمایہ دار معاشرہ کے اس اصول کے بالمقابل جس کا اظہار اس ضرب المثل میں کیا جاتا ہے کہ ہر فرد دوسرے کا دشمن ہے اور ہر آدمی دوسرے کے لئے بھیڑیا ہے ہم ایک اشتراکی معاشرہ کی تعمیر کر رہے ہیں جس میں ہر آدمی دوسرے کا بھائی ہے اور ہر آدمی دوسرے آدمی کا رفیق ہے" "سب سے اہم اخلاقی فتح جو سوویٹ نظام نے حاصل کی وہ یہی جذبہ رفاقت" ہے اور اس لحاظ سے اشتراکی معاشرہ ایک اخلاقی معاشرہ ہے جیسا کہ گرین نے کہا تھا کہ "معاشرہ کے لئے ایک مشترک اخلاق کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے اشتراکی معاشرہ نے ایک اہم اخلاقی اصول کی تکمیل کی ہے کیونکہ یہاں اس خیر مشترک کے شعور کی راہ میں جو مادی اور خارجی رکاوٹیں حق کا اظہار اغراض اور مفادات کے تصادم میں ہوتا تھا دور کر دی ہیں۔ اب یہاں ایک طبقہ دوسرے کے خلاف ایک فرد دوسرے فرد کے خلاف نبرد آزما نہیں بلکہ تمام افراد میں کامل تعاون عمل اور جذبہ رفاقت موجود ہے۔

سیّد عالم خوندمیری ایم اے متعلم ال ال بی (ابتدائی)

لطائف و ظرائف

ہمارے ملک میں ایسے بہت سے بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اور بات چیت میں ہزاروں دلچسپ باتیں کہی اور لکھی ہیں بعض کا تو یہ حال ہے کہ آج ان کی شہرت ان کے اشعار یا کتابوں سے زیادہ ان کی بات چیت لطیفوں، چٹکلوں، ان کی زندہ دلی اور ہجو سے ہے۔ گزشتہ زمانہ میں اردو شاعری میں ہجو کا بہت رواج تھا اتنا رواج کہ ہر وہ شخص جو زمانہ کے ہاتھوں ستایا ہوا ہوتا اور جس میں مصرع سیدھا کرنے کی ذرا بھی قابلیت ہوتی دل کے جلے پھپولے پھوڑنے ہجو کا رخ کرتا اور صفحے کے صفحے کالے کرتا۔ اگر طبیعت میں مناسبت، ظرافت اور شوخی ہوتی تو ہجو اتنی مزہ دار ہو جاتی کہ ہر شخص تفریح، مذاق اور دل لگی کے لیے ہی پڑھتا اور لطف اٹھاتا یہی وجہ ہے کہ میر جعفر زٹلی (۱۶۵۹ - ۱۷۱۳ء) کا نام آج بہت سے لوگوں کی زبان پر ہے۔ اس نے کئی لوگوں کے متعلق ایسی ہجویں لکھی ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے۔ اور بہت سے مخالفوں پر ایسی پھبتیاں کسی ہیں کہ وہ ہنسی اور قہقہوں کا نشانہ بن گئے۔ آخر میں اُس کی ہزل اور ہجو رنگ لائی اور وہ بادشاہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

اُن لوگوں میں جنہوں نے ہجو نگاری کو ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔ مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ تا ۱۷۸۰) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دلی میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ لیکن جب شہر نادر شاہ، احمد شاہ، اور مرہٹوں کے حملوں سے ویران ہو گیا تو پہلے فرخ آباد گئے پھر فیض آباد کا رخ کیا اور آخر میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ لکھنو پہنچے۔ اور وہیں مر کر اٹھے۔ مرزا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہجو کو تمام لوازمات کے ساتھ استعمال کیا اور اسے شاعری کی ایک صف بنا دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس فن سے فطری لگاؤ تھا۔ انھوں نے جس تیزی، طنز، اور ظرافت کے لباس میں خیالات ادا کئے ہیں وہ گدگدی اور سنسناہٹ پیدا کرتے ہیں۔

زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے وہ نشان ملامت نہ بنائے ہوں۔ جوانوں کی کمزوریاں، بوڑھوں کی گمراہیاں، اوراس وقت کے نوابوں کی عیاشیاں ان کا تختۂ مشق بنیں۔ اپنے زمانہ کی مختلف برائیوں کی بھی انھوں نے ایسی خبر لی کہ ایک اصلاحی پہلو نکل آیا۔ دشمن تو دشمن دوستوں کو بھی نہ چھوڑا اور جب کسی کا پیچھا کیا تو آخر وقت تک ہاتھ نہ دھویا۔ جب کسی سے چل جاتی تو فوراً اپنے غلام "غنچہ" نامی کو آواز دیتے اور وہ قلم کاغذ اور دوات لے کر خدمت میں حاضر ہوتا اور یہ طنز ہزل اور ہجو کے ایسے پھول تراشتے کہ مخالفین تڑپ کر رہ جاتے۔ اس طرح وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے لیکن لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹ جاتے۔ عجب بات تو یہ ہے کہ ان کی ہجو سوز اور ساز، آنسوؤں اور قہقہوں کا سنگم ہوتی ہے۔ اپنے موضوع پر اتنا حاوی ہوتے ہیں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ان کی باریک نظر سے نہیں بچتی۔ اس سے ان کے وسیع معلومات، زبان پر قدرت اور نظر کی باریکی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نواب آصف الدولہ والی اودھ ایک نیک طبیعت اور صاحب ذوق انسان تھے۔ نواب صاحب نے مرزا کو نہ صرف "ملک الشعرا" کا خطاب دیا تھا بلکہ سالانہ چھ ہزار کی منصب بھی مقرر کی تھی۔ مرزا نے ان کی تعریف میں بہت سے قصیدے کہے ہیں اور ان کے دشمنوں کی مذمت کی ہے۔ یہ اکثر نواب کے ساتھ ہوتے اور باتوں کے طوطے مینا سے دل بہلاتے۔ ایک وقت کا ذکر ہے کہ نواب محل میں آرام فرما رہے تھے۔ ان کی انا کی شریر لڑکی نے ایسا شور مچایا کہ نواب اٹھ بیٹھے۔ گڑبڑ کی وجہ معلوم ہوئی تو آپ نے سودا کو طلب کیا اور ایک ایسی ہجو لکھنے کی فرمائش کی کہ وہ شوخ لڑکی پھر سے دم نہ مارے۔ نواب کا کہنا مرزا کے لئے سر آنکھوں پر تھا۔ فوراً دوات، قلم لے کر بیٹھ گئے اور وہیں ایک ہجو لکھ ماری جس کا یہ شعر اب تک لوگوں کی زبان ہے۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے   نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

مرزا میں خاص بات یہ تھی کہ وہ مذاقیہ پہلو میں بات سے بات نکال لیتے تھے۔ چنانچہ شیخ قائم علی جو کہ ایک اچھے شاعر تھے شاگردی کے خیال سے خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ سودا نے تخلص دریافت کیا تو شیخ نے کہا "امیدوار" اس تخلص نے مرزا کی آنکھوں میں شرارت کی چمک اور

اور ہونٹوں پر ایک ہلکی سی ہنسی دوڑادی اور کہہ اٹھے۔

ہے فیض سے کسی کے شجر ان کا باردار اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

شیخ جی بہت جھنجھلائے اور اس عہد کے ساتھ لوٹے کہ اس قسم کے بکھیڑا استادی شاگردی کا خیال تک دل میں نہ لائیں گے انھوں نے پرانے تخلص امیدوار کو سلام کیا اور نیا تخلص قائمؔ اختیار کیا۔

مرزا کی زندہ دلی نے بڑھاپے میں بھی ساتھ نہ چھوڑا گو بڑھاپے کا زمانہ تھا مگر طبیعت جوان تھی۔ ایک مشاعرہ میں سید انشاء اللہ خاں انشاؔء اپنی غزل سنا رہے تھے جس کے ایک دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جھڑکی سہی ادا ہی سہی چین جبیں سہی سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

انشا کا جوانی کا زمانہ تھا اور بہار کے دن۔ خدا نے صورت شکل بھی دی تھی جب وہ اس شعر پر پہنچے

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

تو مرزا سے رہا نہ گیا اور مسکرا کر پکار اٹھے " دریں چہ شک " مشاعرہ میں کھلبلی پڑ گئی۔

مرزا رفیع سوداؔ کے مرنے کے تیس سال بعد (۱۸۱۰ء) میں اردو کے ایک ظرافت پسند شاعر شیخ قلندر بخش جرأتؔ اس زمانہ میں لکھنو پہنچے ہیں۔ جب انشاءؔ اور مصحفیؔ کی نوک جھونک کے چرچے نہ صرف دربار میں بلکہ سارے شہر میں مشہور تھے۔ جرأت پہلے نواب محبت خاں کے ہاں ملازم ہوئے اس واقعہ کو انھوں نے کس دلچسپ انداز سے باندھا ہے۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

ایک وقت جاڑے کے موسم میں نواب محبت خاں کے مختار نے انھیں مقررہ موسمی کپڑے نہیں دلئے جرأت نے مختار جی کے سامنے یہ رباعی کہی اور کھڑے کھڑے سرمائی حاصل کرلئے۔

مختاری پہ آپ کیجئے گا نہ گھمنڈ کہتے جسے نوکری ہے ہیچ ارنڈ

سرمائی دلائیے ہماری ورنہ تم کھاؤ گے گالیاں ہم کھائینگے ٹھنڈ

ادبی جھگڑوں کے لحاظ سے ماشاء اللہ خاں کے بیٹے انشاء اللہ خاں کا درجہ شیخ قلندر بخش جرأت میر الٰہ نار نوی، میر غلام حسین افسق، مرزا قتیلؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ۔ اور مرزا رفیع سوداؔ سے بھی بڑھا ہوا ہے

انشاء بنگال کی راج دہانی مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اور سچ مچ باتوں کے بنگالے نکلے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں ۱۷۸۶ء میں دلی آئے اور میٹھی میٹھی باتوں سے سب کا دل موہ لئے۔ دلچسپ حکایتوں، لطیفوں اور ہنسانے والے اشعار سے بہت جلد دوسرے درباری شاعری کو نیچا دکھائے۔

اس زمانے میں دلی کے شاعروں میں حکیم ثناء اللہ خاں فراق، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، شاہ ہدایت، میاں شکیبا، میر قمرالدین منت، شیخ ولی اللہ محب، اور مرزا عظیم بیگ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن انشاء کے آگے ان کی شاعری پھیکی پڑ گئی۔ دلوں میں میل آیا اور یہ ایک دوسرے پہ جملے کسنے لگے۔ سوداؔ کے شاگرد مرزا عظیم بیگ انشاء سے خاص طور سے بگڑے ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے جب اپنی ایک غزل جو بحر رجز میں تھی انشاء کے سامنے پڑھی تو اس وقت انشاء نے بڑی تعریف کی اور مشاعرہ میں پڑھنے کی تاکید کی لیکن جب عظیم وہی غزل مشاعرہ میں سنائی تو انشاء نے انہیں ٹوک کر آڑے ہاتھ لیا اور کہا کہ اس کے بعض شعر تو بحر رمل کے ہیں۔ پھر ستم یہ کہ ان کی مذمت میں ایک مخمس بھی پڑھ ڈالا۔ جن کے شعر یہ ہیں۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے		کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے		پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

مرزا عظیم بیگ نے بھی جواب میں ایک مخمس لکھا جس میں انہیں دہقان بنا ڈالا۔ کہتے ہیں۔

وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم		تحصیل صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم		منطق بیان معانی کہیں سب زمین کو چوم

تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اسی طرح انہوں نے مخمس میں انشاء کو جگہ جگہ طفل مکتب، جاہل، بدتمیز، بیوقوف اور آفت کا پرکالا بنایا ہے دلی سے جب دل اکتا گیا تو انشاء لکھنو پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ شاہ عالم کے مصاحب اور پھر مصحفی کو ہٹا کر خود ان کی جگہ استاد بن بیٹھے۔ مزاج کے منچلے تھے اس لئے یہاں بھی دیر تک نہ رہے تفضل حسین خاں علامہ کے ذریعے نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ کے دربار میں پہنچ گئے۔ یہاں ایسی

عزت، دولت اور شہرت حاصل کی کہ شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ انہیں خاص طور پر اردو زبان پر بڑی قدرت تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی ان میں خاص خوبی تھی۔ وہ ہر بات آسانی سے مذاق میں ڈھال لیتے تھے وہ نہایت حاضر دماغ اور حاضر جواب بھی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ شیخ قلندر بخش جرأت سے ملنے گئے جو ایک زمانہ سے آنکھوں کی قوت کھو چکے تھے۔ جرأت شعر کی فکر میں کھوئے ہوئے تھے اور ایک ہی مصرع کو دل میں بار بار پڑھ رہے تھے۔ انشاء نے انہیں جب اس حالت میں دیکھا تو وجہ پوچھی۔ جرأت نے کہا بھئی ایک اچھا مصرع ہاتھ لگا ہے مگر جب تک دوسرا نہ ہو جائے تمھیں نہیں بتاؤں گا۔ نوجوان شاعر نے جب اصرار کیا تو جرأت نے یہ مصرع پڑھا۔ ع

"اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی"۔

اور اسے گھڑی گھڑی دہرانے لگے۔ انشاء نے فوراً دوسرا مصرع سیدھا کیا اور اس طرح شعر پورا کیا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

اس پر جرأت بے اختیار ہنس پڑے اور یہ کہتے ہوئے کیوں صاحبزادہ ہم ہی پر ہاتھ صاف کرتے ہو لکڑی لے کر مارنے اٹھے اور انشاء یہ حال دیکھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

زبان کی اسی بے لگامی اور طبیعت کی بے پناہ شوخی نے آخری زمانے میں ایسے مخالف حالات پیدا کر دیے کہ ان کی جان پر آبنی:

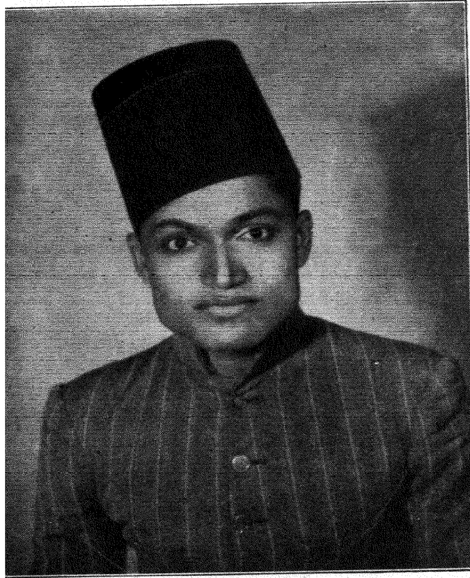
محمد بن عمر ایم۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ



مسٹر محمد عبد الحفیظ ایم۔ایس۔سی (آخری)

نائب صدر بزم طبیعیات

مسٹر حفیظ کی طالب علمانہ زندگی شاندار علمی
فتوحات سے مملو ھے انھوں نے امتحان
بی۔ایس۔سی میں بدرجہ اول کامیابی حاصل کی ھے



مسٹر غلام محبوب انصاری بی۔اے (آخری)

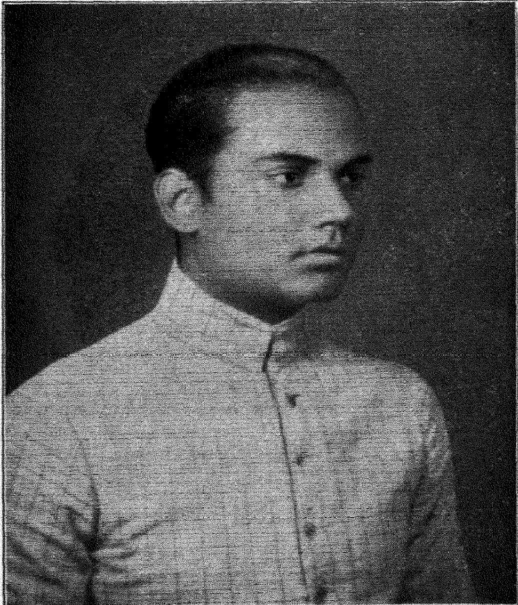
نائب صدر بزم فلسفہ

مسٹر انصاری جامعی و غیر جامعی' معاشری و تمدنی
تحریکات میں نمایاں حصہ لیتے ھیں ان کا تعاون
ان تحریکات کے استحکام و تقویت کا ضامن ھوتا ھے



مسٹر اعظم خاں ایم۔اے (عثمانیہ)

مسٹر اعظم کا شعبۂ اردو کی لکچراری پر انتخاب عمل میں آیا ہے۔یہ عثمانی روایات خلوص وھمدردی کے ایک بہترین نمائندہ ہیں



مسٹر امجد علی خاں یوسف زئی بی۔اے (عثمانیہ)

مسٹر امجد وسیع تر احساس کے ساتھ داماں اردو کو ہندی' مرہٹی اور گجراتی جواہر پاروں سے مالا مال کررہے ہیں۔ان کے تراجم مشہور رسائل میں شائع ہوتے ہیں

پہلی کہانی

ہماری پہلی کہانی جب "کرن" میں چھپی تو ہم ایسے خوش ہوئے جیسے ڈربی کی لاٹری ہمارے نام کھل گئی ہو ۔۔۔ مسرت و خوشی کے نشہ میں مست ہم اپنی بیگم کے پاس پہنچے ۔ وہ بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں ۔۔۔ "دیکھا! آج ہماری ایک کہانی چھپی ہے"۔ ہم نے اپنے چھپے ہوئے نام پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ادھر بیگم نے کہانی پڑھنی شروع کی، ادھر کسی صاحب کا آدمی ہمیں بلانے آگیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد ان صاحب سے چھٹی ملی ۔۔۔ گھر پہنچے۔ سمجھ رہے تھے کہ بیگم مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہیں گی اور ہمیں مبارک باد دیں گی۔

مگر یہ کیا! یہاں تو حال ہی دوسرا تھا۔ چولہے پر جو سبزی چڑھی تھی وہ دور پھینک دی گئی تھی اور بیگم مارے غصے کے سرخ ہو رہی تھیں۔ ہم نے ہمت کر کے آہستہ سے پوچھا "کیا ہوا؟" "شرم نہیں آتی چمار کی لڑکی سے محبت کرتے ہوئے؟" جوالا مکھی ابل پڑی۔ "چھی .... چھی .... کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ کس نالائق نے کہا" ۔۔۔ "کہے گا کون! یہ دیکھئے!!" ۔۔۔ اور ہماری چھپی ہوئی کہانی سامنے رکھ دی۔ کہانی میں ہم نے ہیرو کے نام کی بجائے "میں" لکھا تھا جس کے معنے بیگم نے کہانی لکھنے والے کے لئے تھے۔ ہم نے کہا "یہ تو لکھنے کا ایک ڈھنگ ہے" ۔۔۔ "ڈھنگ ونگ میں کچھ نہیں جانتی۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے ماں کے پاس پہنچا آؤ" ۔۔۔ اور میکے جانے کی تیاری ہونے لگی۔ ہم نے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن تربابٹ کے آگے ہماری کچھ پیش نہ گئی۔ آخر کار ہم نے مجبور ہو کر بیگم سے کہا۔ "اس بار ہمیں معاف کر دو آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی"۔ اب ہم کیا خاک کہانی نویس بنیں گے! (ماخوذ از ہندی)

سید محی الدین احمد
متعلم بی۔اے (آخری) شعبۂ اردو

کیلنڈر

اسکول کی گھنٹی کی کرخت آواز لڑکیوں کو بے حد رسیلی معلوم ہوئی۔ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی سب نے کتابیں اُٹھالیں۔وہ باہر بھی نکل جاتیں لیکن استانی کو کرسی پر بیٹھی دیکھ کر اپنی اپنی جگہ چپ ہوگئیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چمن میں اُڑنے والی سیکڑوں تتلیوں کی چہل پہل اک دم رُک گئی ہو۔رفیعہ یہ محسوس کرکے فوراً اُٹھ گئی۔وہ مسکرا دی مسکراتے ہوئے باہر نکلنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر اسے خیال آیا — کبوتروں کے ڈربے کا ڈھکن اُٹھا دیا جائے تو وہ ایسے ہی باہر نکلتے ہوں گے؟ — ہری ساڑھیاں، کالی چوٹیاں، گلابی فیتے، نیلے پیلے فراک! جیسے قوس قزح رقص کرتی ہوئی کلاس سے باہر جا رہی تھی — آخر میں ایک لڑکی نے چلتے چلتے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور "آداب استانی ماں!" کہہ کر چلدی — استانی ماں! وہ برابر پانچ سال سے یہ لفظ سُن رہی تھی۔لیکن آج سے پہلے کبھی اس قدر تکلیف دہ معلوم نہ ہوا خصوصاً لفظ "ماں!" اُس نے فوراً منی بیگ کھول کر آئینے میں اپنا منہ دیکھا۔اس کا دل کہتا تھا — اُردو زبان بالکل بے ڈھنگی ہے۔۲۵ سالہ جوان عورت استانی بن جائے تو کیا اسے "ماں" کہنا ضروری ہے؟ ہشت! — رفیعہ اسکول کے صحن میں آئی تو سارا صحن لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ایک دوسرے سے چہلیں کرتی ہوئی باہر نکلنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا۔جب وہ چھوٹی تھی تو چھٹی کی کتنی مسرت ہوتی تھی! — لیکن آج صبح کیلنڈر کا صفحہ بدلنے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا گر مجبوراً پیچھے کھینچ لینا پڑا۔۲۵ گیا، ۲۶ گیا اور گیا ۳۰ — سب دن ایک سے!

جب وہ گھر پہنچی تو خادمہ کروندے لے آئی۔اس نے یوں ہی ایک دو کروندے مُنہ میں ڈال لئے بیج پھینکنے کے لئے وہ کھڑکی تک گئی۔کروندے کا وہ سیاہ رنگ، وہ کھٹ مٹھ ذائقہ —اور یہ بیج کروندے کے

پیٹ میں رہتے ہوئے بھی غیر متاثر رہے! اس کا دل کہتا تھا ــ اس کا جیون بھی ان بچوں کا سا ہے؟ اس کے اطراف ......

میز پر رکھی ہوئی کتابوں پر نظر پڑی۔ پانچ سال پہلے وہ کتنی آرزو اور شوق سے اس کرسی پر بیٹھی تھی۔ کمسن لڑکیوں کی زندگی سنوارنے کی پاکیزہ ذمہ داری قبول کی تھی! کتابیں پڑھنے، خلاصے لکھنے، مشاہیر کی سیرت بیان کرنے، کتنے ہنگاموں میں ختم ہوا ایک سال! لیکن پہلے سال کا لطف دوسرے سال نہ آیا تیسرے سال وہ کس قدر بیزار ہوگئی۔ اور چوتھے سال تو مقویات استعمال کرنے لگی تھی اور اس سال تو ــ

بکم امداد سے اسکول کا چھٹا سال شروع ہونے والا تھا۔ اور اُسے ایسے کتنے برس گزارنے ہیں! سال گزرتے ہیں تو جیل کے قیدیوں کی رہائی کی اُمید بڑھتی جاتی ہے لیکن سماج کے بے گناہ مجرموں کی حالت بالکل نرالی ہے۔ وہ سوچنے لگی ــ چھٹیوں کے بعد ہی سردی تھوڑی شروع ہوگی؟ اچھی خاصی گرمی رہتی ہے۔ سویرے ساڑھے پانچ بجتے ہی صبح نمودار ہو جاتی ہے اور شام کے ساڑھے سات ہونے پر بھی شام کی سیاہی زمین پر ہی جھولتی رہتی ہے ــ محبت کرنے والا بوسہ لے کر چلا جاتا ہے تو بھی محبوب کے دل میں اس کی میٹھی ترنگ ...... رفیعہ چونک پڑی۔ اس تصور سے اُسے حیرت ہوئی۔ اس کا دل کہتا تھا ــ حیرت کی بات ہی کیا ہے؟ ایسے تصورات عمر کا تقاضا ہیں۔ تو استانی ضرور ہے لیکن راہبہ نہیں!

اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ڈاکیہ سامنے کی عمارت میں داخل ہوا۔ دوسری منزل میں کھڑی ہوئی ایک جوان لڑکی اسے دیکھتے ہی عجلت سے نیچے اُترنے لگی۔ رفیعہ کو یاد آیا۔ گزشتہ مہینے اس کی شادی ہوئی ہے ــ رفیعہ دیکھ رہی تھی ــ اس حسینہ نے ڈاکیہ کے ہاتھ سے خط تقریباً چھین لیا۔ ساتھ ہی اس کے گلاب کھل اُٹھے۔ اس کے شوہر ہی کا خط ہوگا! ــ اُس نے ایک آہ کھینچی۔ دُکھے ہوئے دل کے ساتھ میز کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ وہ گھڑی کی طرف دیکھنے لگی ــ ٹک ٹک کی آواز اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ اس نے میز کی طرف دیکھا۔ بالکل درمیان میں اس کی تصویر رکھی تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ نوکر ہوئی تو یہ تصویر

کھنچوائی تھی۔ اُسے تصویر پر بے حد غصہ آیا۔ اس نے تصویر اُٹھا کر میز کی دراز میں ڈال دی
ٹک ٹک ... ٹک ٹک ... پھر اس کے کانوں میں آواز گونجنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دماغ خیالات کے ہجوم سے بیکار ہو گیا ہے وہ بے چینی سے پیچھے پلٹ کر دیکھی۔ کیلنڈر پر پھر اُسے ۲۵ خورداد کی تاریخ نظر آئی۔ اُسے یکم امرداد کی یاد آئی۔ ۳۵ دن! ہر دن کے چوبیس گھنٹے ــــ ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ .... کیسے کاٹے یہ وقت؟ ــــ اسے اپنی اسکول کی سہلیاں یاد آگئیں۔ ان میں کی اکثر اپنی گرہستی میں مگن تھیں ــ! اسے خیال آیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ طویل عرصہ کسی کی میٹھی باتوں، دلچسپ صحبت اور کسی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کٹ جاتا ــــ پھر زور سے ٹک ٹک کی آواز آئی۔ اب کہیں اس کا خیال دروازہ پر پہنچا۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکیہ کھڑا تھا ــــ میرا خط؟ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے ــ خط ماں کا ہوگا کسی سے منت کر کے لکھوایا ہوگا سوچتی ہوگی بیٹی ماں کے پاس رہے ــــ رفیعہ کے دل میں یہ خیالات چکر لگا رہے تھے اور نگاہیں خط پر گھوم رہی تھیں۔ یکایک نظر "تمہاری صبیحہ" پر پڑی لیکن ــــ اس کی آنکھوں میں حیرت انگیز چمک پیدا ہوگئی۔ وہ جلدی سے سامان لپیٹ کر چلدی ــــ

صبیحہ کے پاس جانے کے بعد وہ سکون اور آرام محسوس کرنے لگی تھی۔ قفس سے چھوٹنے پر پرندہ جیسا درخت کی ایک پھننگ سے دوسری پھننگ پر بیٹھتا اور ریتوں کو ٹھونگیں مارتا ہے نا۔ رفیعہ کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی!

اسکول کے زمانے میں صبیحہ اس کی جگری دوست تھی۔ گزشتہ پانچ برسوں سے ان کی ملاقات نہ تھی اس لئے یہ ایک طرح سے مسرت ہی کی تو بات تھی لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ رفیعہ ایک سکھی زندگی گزار رہی تھی ــــ رفیعہ کا کمرہ اس کے کمرے اتنا ہی تھا لیکن اس کمرہ میں میز پر صبیحہ اور مزمل کی ایک خوبصورت تصویر، حسین لیکن کاغذی پھولوں کا گلدان، نظموں اور افسانوں کی کتابیں اور صبیحہ کے سنگار کے سامان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خلاصوں کی کتابیں، لڑکیوں کی مشقی بیاضیں، چاقو، ربر، دوات ایسی کوئی چیز نہ تھی وہاں! ــ یہ سب دیکھ کر رفیعہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ جنگل سے کسی باغ میں آگئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی "صبیحہ

بڑی قسمت والی ہے!" ـــــ ایک دن صبیحہ کا مزاج خراب ہوگیا۔ شام کی چائے کے وقت دیکھی کہ مزمل صبیحہ کے بستر پر بیٹھا اُسے چائے پینے پر مجبور کر رہا ہے۔ آخر وہ کہنے لگا۔ "چھوٹے بچے کو گود میں لے کر دودھ پلاتے ہیں نا۔ ایسا ہی میں بھی تجھے چائے پلاؤں گا" ـــــ اتنے میں رفیعہ کمرے میں داخل ہوئی تو مزمل وہاں سے اُٹھ گیا۔ ورنہ وہ اس نئی ترکیب پر عمل ضرور کرتا۔ مزمل مُسکراتا ہوا نکل گیا ـــــ

ایک دن رفیعہ کو کنگھی ملتی نہ تھی۔ اس نے خیال کیا صبیحہ نے جلدی میں کہیں رکھ دیا ہوگا اور پھر کچھ سوچ کر میز کی دراز کھولی۔ اس میں کنگھی نہ تھی لیکن دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ رفیعہ کا ذوقِ جستجو جاگ گیا۔ اس نے دستخط دیکھے ـــــ تیرا ہی۔ مزمل!۔ خط پڑھنے کے لیے وہ بیتاب ہوگئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط پڑھ کر اسے محسوس ہوا جیسے وہ چاندنی کے سمندر میں تیر رہی ہے۔ اس کے دو تین جملے تو رہ رہ کر یاد آنے لگے۔ تین ماہ قبل صبیحہ میکے گئی ہوئی تھی۔ اس وقت مزمل نے یہ خط لکھا تھا۔ خط میں اس نے ایک دلچسپ ناول کی نفی کی تھی۔ لکھا تھا ـــــ صبیحہ! بچپن میں استاد نے سکھایا تھا کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اب میرا یہ تجربہ ہے کہ ایک اور ایک مل کر سارا عالم ہوتا ہے! اور اس میں سے کوئی ایک کم ہو جائے تو دوسرے ایک کی قیمت گھٹ جاتی ہے! ـــــ رفیعہ سوچنے لگی۔ یہ محبت کا حساب کتنا اچھا ہے!! اور میں جو جماعت میں پڑھاتی ہوں وہ ـــ الف اور ب کام کرتے ہیں، ب درمیان میں کام چھوڑ دیتا ہے! توبہ، توبہ! ـــــ

مہینہ بھر وہ دل ہی دل میں صبیحہ پر رشک کرتی رہی۔ آخر کار صبیحہ پر اپنا خیال ظاہر کئے بغیر اُسے چین نہ آیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئی ـــ بہن تو قسمت والی ہے!۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سُن کر صبیحہ ضرور مُسکرائیگی۔ لیکن صبیحہ نے اس کی طرف صرف تعجب خیز نظروں سے دیکھا۔

رفیعہ اپنے مستقر آگئی۔ اس کی نظر پھر کیلنڈر پر پڑی۔ وہی تاریخ! اس نے اس تاریخ کو علٰحدہ نہ کیا۔ سوچا سب دن ایک سے ہیں!۔ پھر وہی تنہائی، خلا اور ٹھہراؤ! صبیحہ کے گھر کے تازہ تاثرات کے سبب تو یہ زندگی

اسے بہت ہی تھکا دینے والی محسوس ہوئی، صبح اُٹھنا، ایک پیالی چائے بنانا اور تنہا ہی پینا۔ تنہا ہی کھانا اور تنہا ہی رہنا۔۔۔ یہ تنہائی کی آگ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی ۔۔ وہ نئی نئی کتابیں لے آئی۔ لیکن ہر کتاب کے دس پانچ صفحے پڑھ کر اُکتا جاتی اور کتاب ہٹا کر میز پر رکھی ہوئی صبیحہ اور مزمل کی تصویر دیکھتی رہتی۔ دیکھتے دیکھتے اُسے صبیحہ کی جگہ اپنی ہستی نظر آتی۔ مگر مزمل کی۔۔۔ اس کے لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ جگہ خالی ہی رہتی!۔۔۔

دوسرے دن اسکول کھلنے والا تھا کہ صبیحہ کا خط ملا۔ لکھا تھا۔۔۔ میں گاؤں پہنچ گئی۔ تمھاری بہت یاد آتی ہے۔ کیا بتاؤں زہرہ بہن کے ساتھ وقت کتنا اچھا کٹ جاتا ہے۔ وہ بہت باتونی اور ہشیار ہے۔ وہ تجھ سے ملنے کی آرزومند ہے۔ پانچ منٹ کی ملاقات میں پانچ سال کی دوست بن جاتی ہے۔ اور پھر میں اور وہ کوئی دو نہیں ...... میں اور وہ دو نہیں۔ یہ تو لکھ چکی! لیکن رفیعہ میری ایسی قسمت کہاں؟ رفیعہ! اس کے دو بچے دیکھتے ہی میں کچھ کھو سی جاتی ہوں۔ میرے دو ماہ بعد اس کی شادی ہوئی اور اب اس کے تین بچے ہیں اور میں ۔۔

مزمل مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ لیکن رفیعہ سچ بتاؤں! صرف شوہر کی محبت سے بیوی کو سکون نہیں مل جاتا۔ کسی بیل کو خوبصورت پتے ہیں لیکن پھول ایک بھی نہیں کھلتا۔ میرا جیون ایسا ہی ہے! ایک دن تم کہتی تھیں ۔۔۔ صبیحہ تم قسمت والی ہو!۔۔ لیکن میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ زہرہ خوش قسمت ہے!۔۔۔

تم سمجھتی ہوگی میں سکھی ہوں۔ سکھ؟ گرہستی اور ڈونگر دور ہی سے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سچ کہوں؟ جوالا مکھی اندر ہی اندر اُبلتا رہتا ہے نا۔ بالکل یہی حال ہے میرا! روپیہ ہے! شوہر کی محبت ہے۔ آرام ہے لیکن .... تمھاری!

رفیعہ کیلنڈر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ وہی مہینہ بھر پہلے کی تاریخ اور وہ قریب آئی۔

اور چراچر صفحات پھاڑنے شروع کئے۔ آخر کار آخری تاریخ پھاڑتے ہوئے وہ بولی ـــــ کل کا کام آج !ـــ اور چرـــ

پہلی تاریخ دیکھ کر اسے خیال آیا۔ کل مدرسہ شروع ہوگا ! پھر وہی قفس ! وہی مخصوص دانہ پانی اور وہی رٹتے ہوئے بول ! اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ کیلنڈر کو گھورتی رہی۔ اور ایک دم اس کے ذہن میں صبیحہ کے الفاظ گھوم گئے ـــــ سکھ ؟ گرہستی اور ڈنگر دور سے سہانے نظر آتے ہیں ـــــ جوالا مکھی اندر ہی اندر ابلتا رہتا ہے ـــــ قید سے بھاگا ہوا قیدی کتنا خوش ہوتا ہوگا ! آج میں بھی بے حد سکون سے سوؤنگی ـــــ بڑی دیر تک وہ انھیں خیالات کی گرداب میں پھنسی رہی، کبھی اس کا دل دکھ، مایوسی اور کوفت کے برساتی نالے میں بیٹھ جاتا اور کبھی آرزؤں اور امنگوں کی لہریں مسکرا مسکرا کر ناچنے لگتیں ـــ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر قایم نہ رہ سکی۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ خیال اور حقیقت میں اتنا ہی بعد ہے جتنا قطبین میں ! ـــــ

محمد عبد القادر فاروقی متعلم بی۔اے (ابتدائی)

رباعی

جو دہر میں ہاتھ آتا ہے کھو دیتا ہوں
ساحل پہ سفینے کو ڈبو دیتا ہوں
نادر میں غم آشنا ہوں ایسا کہ یہاں
سامان خوشی دیکھ کے رو دیتا ہوں

سکندر علیخاں نادر متعلم بی۔اے (ابتدائی)

اجنبی اقوام کو مراعات خصوصی

زمانۂ حال میں مراعات خصوصی کے تحت یورپی اقوام کی رعایا کو مشرقی ممالک میں جو خصوصی قانونی حیثیت حاصل رہی ہے اس سے سب لوگ واقف ہیں۔ نیز اس سے بھی کہ ان مراعات سے بیجا فائدہ اُٹھانے کے باعث کس طرح رفتہ رفتہ مشرقی مملکتوں نے ان مراعات کو ختم کردیا لیکن اس سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ یہ چیز کچھ اہل مغرب ہی سے شروع نہیں ہوئی بلکہ زمانۂ قدیم میں یہ ایک عام رواج تھا کہ قانون کو مقامی کی جگہ شخصی سمجھا جائے اور جو شخص پیدائشی طور پر جس قانون کا تابع ہو وہی دنیا کے ہر حصے میں اس پر نافذ رہے، چاہے وہ اب اپنی ہی مملکت میں ہو یا غیر ممالک میں سفر کی حالت میں۔

اس مختصر مقالے میں ہم صرف ایک قوم یعنی زمانۂ اسلام کے عربوں کے متعلق کچھ نظائر یکجا طور پر پیش کریں گے جن سے معلوم ہوسکے گا کہ عربوں نے دنیا کے کس کس حصے میں اپنے تجارتی یا دیگر تعلقات قائم کردئے تھے اور ان تعلقات سے مقامی حکومتوں کو کچھ اتنی منفعت تھی کہ وہ بڑی خوشی کے ساتھ ان عرب نوآبادکاروں کو عدالتی مراعات خصوصی عطا کرنے پر آمادہ تھیں۔

اسلامی قانون بے انتہا شخصی ہے اور ساتھ ہی ہمہ گیر بھی ہے جس کے باعث وہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق احکام دیتا ہے چاہے یہ مسائل عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے یا تعزیرات و زواجر سے۔ اسی طرح معاملات چاہے رعایا کے ہوں یا حکومت کے۔ نیز اسلامی مملکت میں پیش آنے والے امور ہوں یا اس کے باہر اجنبی ممالک میں۔ غرض ہر امر کے متعلق شریعت نے احکام دے رکھے ہیں۔ اگرچہ ان میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق بھی ضرور ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ایک حدیث شریف میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر ہے کہ جو مسلمان اسلامی مملکت کے باہر مقیم رہیں تو ان کو چاہیئے کہ عام مسلمانوں کی طرح احکام خداوندی کی تعمیل کرتے رہیں البتہ انھیں اسلامی رعایا کو

حاصل ہونے والے بعض حقوق یعنی اسلامی مملکت کی آمدنی کا حصہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک کہ وہ ترک وطن کرکے اسلامی سرزمین میں نہ آبسیں (دیکھئے صحیح مسلم جلد ۵ صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۰)۔ قرآن مجید میں بھی ایک آیت میں یہ ذکر ہے کہ اگر مسلمان کسی غیر اسلامی مملکت میں مقیم ہوں اور مقامی حکومت ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے تو ایسی صورت میں ان مسلمانوں کے کیا فرائض ہیں۔ نیز اسلامی مملکت کو کیا تدبیریں اختیار کرنے کا حق ہے۔ (دیکھئے قرآن مجید سورۂ ۸ آیت ۷۲ و مابعد)۔ امام ابو یوسف نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے (جیسا کہ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۵ میں ذکر ہے) کہ "المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما کان" یعنی مسلمان احکام اسلامی کا پابند ہوگا چاہے جہاں کہیں بھی وہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک تو احکام کی پابندی اس آزادی پر منحصر ہوگی جو اسے غیر اسلامی مملکت عطا کرے ورنہ بہت سے ممالک میں تو اذان جیسی بے ضرر چیز کی تک ممانعت اب تک باقی ہے۔ دوسرے یہ پابندی اس تحدید و تدارک کی تابع ہوگی جو غیر ممالک میں ان اسلامی احکام کی تعمیل کے لئے پائی جائے۔ تیسرے اگر ایک فریق معاملہ غیر مسلم ہو تو پھر شریعت کی پابندی مسلمان کے لئے اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ بہرحال یہ واضح کر دینا چاہیے کہ مسلمان فقہا اگرچہ اس پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں اپنے شرعی احکام کی تعمیل کے پابند ہیں لیکن ساتھ ہی وہی فقہا یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب کبھی احکام شرعی کی تعمیل نہ کرائی جاسکتی ہو یعنی اختیار سماعت غیر مسلم حکومت کو حاصل ہو تو پھر مسلمان پر شریعت کی پابندی محض اخلاقی رہتی ہے مادی نہیں حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان بیرونی ممالک میں خلاف شرع فعل کا ارتکاب کرے اور پھر اسلامی مملکت کے حدود میں آئے تو بھی اسلامی عدالتیں اس کے مقدمے کی سماعت نہیں کرسکتیں۔ اس اصول پر فقہا اتنا زور دیتے ہیں کہ اگر غیر ممالک میں کسی غیر مسلم نے کسی مسلمان کو مثلاً قتل بھی کردیا ہو تو قاتل کے اسلامی سرزمین میں آنے کے باوجود اس پر اسلامی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا۔ اس بارے میں سرخسی کا ایک اقتباس دلچسپی کا موجب ہوگا۔ "اگر کوئی مسلمان کسی غیر اسلامی سرزمین میں وہاں کی حکومت سے اجازت لے کر داخل ہوا اور وہاں کے لوگوں کو کچھ قرض دے یا ان سے کچھ قرضہ حاصل کرے اسی طرح چاہے اس نے وہاں والوں کی جائداد غصب کی ہو یا خود اس مسلمان کی جائداد غصب کرلی گئی ہو تو ایسے مسلمان کے

مقدمے کی سماعت اسلامی مملکت کی عدالت میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان افعال کا ارتکاب ایسے مقام پر ہوا تھا جہاں اختیار سماعت اسلامی حکومت کو حاصل نہ تھا۔ جہاں تک اس مسلمان کا تعلق ہے جس نے ان لوگوں کی جائداد غصب کی تھی اور اس نے اجازت سفر حاصل کرتے وقت ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس طرح کے جرائم کا ارتکاب نہیں کرے گا تو ایسے شخص کے خلاف مقدمے کی سماعت سے اسلامی عدالت کا انکار کرنا اس امر پر مبنی ہے کہ اس نے اپنے ذاتی اقرار کی خلاف ورزی کی نہ یہ کہ وہ اقرار اسلامی مملکت نے کیا ہو۔ البتہ فقہا اسے ضرور رائے دیں گے کہ وہ ان کی مغصوبہ جائداد کو واپس کر دے۔ لیکن اسلامی قاضی اسے اس پر مجبور نہیں کر سکے گا اور جہاں تک اس اجنبی کا تعلق ہے جس نے وہاں مسلمان کی جائداد غصب کر لی تھی تو اس مسلمان کی دادرسی سے اسلامی عدالت کا انکار کرنا اس امر پر مبنی ہے کہ اس مسلمان کے خلاف جرم کا ارتکاب ایسے مقام پر ہوا ہے جہاں اسلامی عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہ تھا۔ چنانچہ اگر ان لوگوں نے اس مسلمان کو قتل بھی کر دیا ہوتا تو اسلامی عدالت کوئی مواخذہ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اس مسلمان کی جائداد تلف یا غصب کریں تو سماعت سے انکار بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا۔ یہ سب اس اصول پر مبنی ہے کہ جب مسلمان نے خود ہی اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالا اور اسلامی سرزمین کی حفاظت سے باہر نکل کر اپنے لئے خود ہی خطرہ مول لیا تو اس نے اپنی ذمہ داری پر یہ کام کیا ہے۔ قرض دینے کے متعلق بھی یہی احکام ہیں جیسا کہ مدیون غیر مسلم اسلامی سرزمین میں آئے . . . . اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سرزمین میں وہاں کی اجازت لے کر جائے اور وہاں کسی کی جان یا مال کو نقصان پہنچا ہے تو متضرر کے اسلامی علاقے میں آنے پر بھی اس مسلمان کے خلاف اسلامی عدالت میں مقدمے کی سماعت نہیں ہو سکے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہاں کے باشندے انھیں جرائم کا ارتکاب اس مسلمان کے خلاف کرتے تو بھی ان لوگوں کے اسلامی سرزمین میں آنے کے باوجود ان پر اسلامی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت اسلامی اختیار سماعت کے حدود میں نہ تھے۔ یہی حال اس مسلمان کا ہے جب کہ اس نے اس فعل کا ارتکاب ان لوگوں کے خلاف کیا لیکن یہ امر اس مسلمان کے لئے دیانتاً مکروہ ہوگا کہ اپنے کئے ہوئے اقرار کی خلاف ورزی کرے اور یہ خلاف ورزی

حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو قیامت کے دن ایسے شخص کے اوپر ایک جھنڈا لہرایا جائے گا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ ایک غدار شخص ہے۔ چنانچہ اس بناء پر اگر وہ مسلمان اپنے عہد کی خلاف ورزی کر کے جب کچھ جائداد حاصل کرے اور اسے اسلامی سرزمین میں لائے تو دوسرے مسلمانوں کے لئے اس جائداد کا خرید نامناسب نہ ہوگا جب کہ انھیں وہ واقعات معلوم ہوں کیونکہ اس جائداد کا حصول نامناسب وسائل سے ہوا تھا اور اس کے خریدنے سے ایسے شخص کو ترغیب ہوگی کہ آئندہ بھی اس طرح کے افعال کا ارتکاب جاری رکھے اور کسی مسلمان کے لئے ایسی چیز میں مدد دینی جائز نہیں۔ یہ چیز بھی ایک حدیث پر مبنی ہے کہ المغیرہ بن شعبہ نے اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کا مال لوٹنے کے بعد مدینہ آکر اسلام قبول کیا تھا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ اس لوٹ کو جائز مال غنیمت قرار دے کر حسب قاعدہ اس کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے کے لئے قبول کر لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا اسلام تو قبول کیا جاتا ہے لیکن تیری جائداد چونکہ غداری کی کمائی ہے اس لئے ہمیں وہ درکار نہیں ——— ایسی جائداد کو خریدنے کی ممانعت قطعی نہیں ہے بلکہ اسے مکروہ قرار دیا گیا ہے" (مبسوط سرخسی جلد ۱ صفحہ ۹۵ تا ۹۶)۔

اگرچہ مسلمان فقہاء شریعت کے شخصی ہونے پر زور دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ مسلمان جہاں بھی ہو اپنے قانون کی اتباع کا پابند ہے لیکن پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو مسلمان غیر ممالک میں مقیم ہوں ان پر دو طرح کی سختیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو اسلامی قانون خود ان کی قانونی اہلیت گھٹا دیتا ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان اسلامی سرزمین میں کسی کو امان دینے کا مجاز ہوتا ہے لیکن جو مسلمان غیر ممالک میں ہو وہ وہاں کسی شخص کو امان دینے کا مجاز نہیں ہوتا جیسا کہ مبسوط سرخسی جلد ۱ صفحہ ۰۷ میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے مسلمان کو اپنے مقام سکونت کے قوانین واحکام کی تعمیل کرنی پڑے گی جو بسا اوقات اسے شریعت کی تعمیل میں مانع ہو سکتے ہیں۔

اس بارے میں تاریخی نظائر سے بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے ہم عہد نبوی میں ہجرت حبشہ سے دو چار ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ابھی کوئی اسلامی مملکت وجود میں نہیں آئی تھی

البتہ ان مہاجرین حبشہ کی جب پندرہ سال بعد واپسی ہوئی تو مدینۂ منورہ میں اسلامی مملکت وجود میں آچکی تھی۔ بہرحال ہجرت حبشہ کے آغاز پر جو صورت حال تھی اس کے متعلق مورخوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو وہاں ضمیر کی مکمل آزادی حاصل تھی اور وہ باوجود حبشیوں سے الگ مذہب رکھنے کے عقائد اور عبادات میں اسلامی قانون کی بے کھٹکے تعمیل کرسکتے تھے۔ جب ان لوگوں کو مکہ میں ستایا جارہا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ:۔

"تم حبشہ جاؤ وہاں ایک ایسا حکمران ہے جو انصاف کرتا ہے ظلم نہیں کرتا" سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مروی ہے۔ یہ مہاجر بیان کرتے ہیں کہ انھیں وہاں روزانہ اسلامی طریقے پر نماز پڑھنے اور خدا کو ایک ماننے وغیرہ میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی بلکہ دو مرتبہ جب مکہ والوں کا وفد اس غرض سے حبشہ آیا کہ تحویل ملزمین کے اصول پر ان لوگوں کو مکہ والوں کے سپرد کردیا جائے تو نجاشی یعنی حکمران حبشہ نے اس سے قطعی انکار کیا تھا (طبقات ابن سعد جلد ۱ حصۂ اول صفحہ ۱۳۶، سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۱۷ و مابعد نیز ۱۶، ۷ و مابعد، تاریخ طبری سلسلہ اول صفحہ ۱۶۰۶، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۹۸ Rivista degli Studi Orientali Voex (1923) PP 90-98

اس کے برخلاف اسی عہد نبوی میں شمالی عرب کے علاقہ معان کا گورنر جب مسلمان ہوگیا تو بیزنطینی یعنی رومی قیصر نے اسے حکم دیا کہ فوراً مرتد ہوجائے۔ جب اس نے انکار کیا تو اسے سزائے موت دے دی گئی (طبقات ابن سعد جلد ۱ حصہ دوم صفحہ ۳۱، سیرت ابن ہشام صفحہ ۹۵۸۔ اس نومسلم گورنر اور پیغمبر اسلام کی خط و کتابت کے متن کے لئے دیکھئے میری تالیف الوثائق السیاسیہ۔) مسلمان مورخ ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں قیصر روم کے دربار کے ایک بہت بڑے پادری ضغاطر Auto Cratis نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو عیسائی حاضرین نے اسے وہیں قدموں میں مسل کر مار ڈالا (تاریخ طبری سلسلہ اول صفحہ ۱۵۶۷)۔

غیر ممالک میں مسلمانوں سے اچھے یا برے برتاؤ کی مثالیں بے شمار ہیں جن میں سے چند

قدیم کا ہم ابھی نیچے ذکر کریں گے۔ لیکن یہ واضح کردینا ہے کہ سلوک کا اچھا یا برا ہونا عموماً حکمران وقت کے رجحان کا نتیجہ ہوا کرتا تھا نہ کہ کوئی اصول اور مقررہ قاعدہ۔

مسلمانوں کے لئے ممالک غیر میں مراعات خصوصی

اس بارے میں اب تک کوئی تفصیلی مواد جمع نہیں ہوسکا ہے جس کے باعث قانون مراعات کا کوئی نظام مستنبط کرنا آسان نہیں۔ یہاں فی الحال ہم اس طرح کا مواد یکجا کردینے پر اکتفا کرتے ہیں:-

(۱) ۳۱ھ میں جب کہ حضرت عثمانؓ خلیفہ تھے مسلمانوں اور نوبیہ کے عیسائی بادشاہ میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں یہ قرار پایا تھا کہ اگر مسلمان نوبیہ جائیں تو کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ نیز اس کے پائے تخت ونقلہ کی مسجد میں اگر وہ نماز پڑھیں تو اس کی کوئی ممانعت نہیں کی جائے گی۔ تحویل ملزمین کے متعلق بھی اسی معاہدے میں بعض انتظام منظور کئے گئے تھے (خطط مقریزی مطبوعہ بولاق جلد ا صفحہ ۲۰۰)۔

(۲) حجاج بن یوسف گورنر عراق کے زمانے میں جب کہ خلافت بنی امیہ کا آغاز تھا تو بہت سے مسلمان عراق سے بھاگ کر ملیبار (جنوب مغربی ساحل ہندوستان) میں آ پناہ گزیں ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا تھا اس کے متعلق ہمارے مورخ نے لکھا ہے کہ "یہ اعانت باد موافق و مخالف مختلف بنادر میں پہنچے۔ ہنود اس نئی قوم کو دیکھ کر اترنے میں مانع ہوئے۔ آخر میں نہایت عاجزی و التجا کرنے کے بعد عہد و پیمان لے کر اترنے کی اجازت ملی۔ اولاً انھیں بنادر میں قول و قرارنامہ دے کے فروکش ہوئے۔ اقرارنامہ اس بات کا تھا کہ ہنود کی طرز روش میں رہیں اور لباس بھی اس دیس کا اختیار کریں۔ غربائے اسلام نے بہ امر لاچاری بہ مصداق ضرب المثل ؎ جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہنود کا لباس اختیار کیا اور اہل اصنام کے ساتھ مل جل کر شیر و شکر کی طرح رہنے لگے اور مقتضائے حال کے موافق ہر ایک نے پیشہ و حرفہ اختیار کیا اور کمال ہشیاری سے زندگی بسر کرتے تھے اور اسلامی شعار نہایت احتیاط سے ادا کرتے تھے۔ اذان و قراءت و قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ کوئی فرد ہنود

نہ سنے" (محبوب الوطن مولفہ عبد الجبار خاں ملکاپوری صفحہ ۴۰)۔

(۳) مسلمان حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں بمبئی اور سندھ کے ساحلوں پر پہنچ گئے تھے جیساکہ بلاذری نے فتوح البلدان میں اور قدامہ بن جعفر نے کتاب الخراج میں تفصیل سے بیان کیا ہے ۔چنانچہ ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ہندوؤں کا شہر مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گیا تو ہندوؤں نے وہاں کی مسجد مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دی جہاں وہ جمعہ کی نماز کے خطبہ میں خلیفۃ المسلمین کے لئے دعا کرنے کی بھی آزادی رکھتے تھے (قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج مخطوطہ استنبول باب ۴ فصل ۱۹)۔

(۴) مسعودی نے چوتھی صدی ہجری کے پہلے عشرہ میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی وہ لکھتا ہے کہ ۳۰۴ھ ہجری میں میں نے صیمور (حالیہ چاول) کی سیاحت کی جو لار (گجرات) کا ایک جزء ہے۔یہاں کے حکمران کا لقب بلہرا (والبہ رائے) ہے جو راجہ اس وقت حکمران تھا اس کا نام چنچا تھا وہاں تقریباً دس ہزار مسلمان تھے جن میں بیاسرہ بھی شامل ہیں (اس کی تشریح ابھی نیچے آئے گی) چنانچہ وہاں سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دیگر مقاموں کے لوگ رہتے تھے جنھوں نے وہاں شادیاں کرلی تھیں اور وہیں مستقل طور سے بس گئے تھے ان میں مالدار تاجر بھی تھے جیساکہ موسیٰ بن اسحاق السندلونی جسے ہنرما کا عہدہ بھی حاصل تھا ...... ہنرما سے مراد مسلمانوں کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے جسے اس ملک کا راجہ معزز مسلمانوں میں سے چن کر مقرر کرتا ہے ۔ یہ تمام مسلمانوں کا سردار ہوتا ہے اور راجہ اسے یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ ان کے جملہ معاملات کا انتظام کرے ۔بیاسرہ کی اصطلاح اصل میں لفظ بیسر کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو مسلمان والدین سے ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں (مسعودی کی مروج الذہب مطبوعہ یورپ جلد ۲ صفحہ ۸۵ تا ۸۶)۔

اسی مولف نے ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ پورے سندھ اور ہند میں بلہرا سے بڑھ کر کوئی اور راجہ نہیں ہے جو مسلمانوں کا احترام کرتا ہو۔چنانچہ اس کے علاقے میں اسلام معزز و محترم ہے۔ وہاں مسلمانوں کی چھوٹی مسجدیں بھی ہیں اور جامع مسجدیں بھی۔یہاں کے راجہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس

سال بلکہ اس سے زیادہ حکمرانی کرتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کا گمان ہے کہ ان کی اس درازی عمر کا باعث مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور مہربانی سے پیش آنا ہے (مسعودی کی مروج الذہب مطبوعہ یورپ جلد اصفحہ ۳۸۲)۔

(۵) بزرگ بن شہریار ایک پرانا مولف ہے جو چوتھی صدی ہجری کے وسط کا مانا جاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں چوری کی سزا عام طور پر موت سے دی جاتی ہے لیکن کوئی اگر مسلمان چوری کرتا ہے تو اس کا مقدمہ ہنرمن کے پاس پیش ہوتا ہے جو شریعی احکام کے مطابق مقدمے کی سماعت کرتا ہے جس طرح اسلامی ممالک میں قاضی ہوتا ہے اسی طرح یہاں ہنرمن ہوتا ہے اس کا انتخاب مسلمانوں ہی میں سے کیا جاتا ہے (عجائب الہند مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۱)۔

اسی مولف کا یہ بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک نووارد مسلمان ملاح نے صیمور میں ایک مندر کی بے حرمتی کی تھی۔ پجاریوں نے اسے پکڑ لیا اور صیمور کے راجہ کے پاس لاکر پیش کیا اور واقعہ سنایا ملاح نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا راجہ نے اپنے لوگوں سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ اسے ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا دیا جائے۔ کسی نے کہا کہ کاٹ کر اس کے پرخچے اڑا دئے جائیں لیکن راجہ نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایک عرب ہے اور ہم میں اور عربوں میں معاہدہ ہے اس لئے اب تم میں سے ایک شخص العباس بن ماہان کے پاس جائے جو مسلمانوں کا ہنرمن ہے اور اس سے پوچھے کہ اگر وہ کسی مسلمان کو اسی طرح کا کام کرتے ہوئے مسجد میں پائے تو اسے کیا سزا دی جائے گی۔ وہ جو جواب دے وہ مجھ سے آکر بیان کرو (عجائب الہند صفحہ ۱۴۳)۔

(۶) ابن حوقل بھی بیان کرتا ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں اس طرح کا رواج ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ آج کل مسلم نوآبادی کا افسر ایک مسلمان ہی ہوتا ہے جو بلہرا کی طرف سے مامور ہوتا ہے اور راجہ اسے اپنے اختیارات تفویض کرتا ہے میں نے اسی طرح کا رواج متعدد ایسے ملکوں میں پایا ہے جو اب غیر مسلم قبضے میں ہیں۔ مثلاً خزر، سریر، لان، غانہ اور کوغا۔ ان تمام ملکوں میں مسلمانوں کی جماعت سوائے مسلمان کے کسی اور کو نہ تو اپنا سردار تسلیم کرتی ہے نہ اپنا حاکم عدالت اور نہ ہی اپنے مقدموں میں

گواہ۔ چاہے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ ان ملکوں میں سے بعض میں میں نے یہ دیکھا کہ کوئی مسلمان کسی معتبر غیر مسلم کو اپنے مقدمے میں بطور گواہ پیش کرتا ہے اگر فریق ثانی اس پر اعتراض نہ کرے تو اس کی گواہی لی جاتی ہے ورنہ پھر کسی مسلمان کو گواہی میں پیش کرنا ہوتا ہے (المسالک والممالک صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۸)۔

(۷) ملیبار کے تعلقات عربوں کے ساتھ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت ہی سے چلے آرہے ہیں۔ ملیبار میں مسلمانوں کی آمد عہد صحابہؓ ہی سے سمجھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ پارس کے رسالے (Revue des Etudes Islamiques بابتہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۰۴) میں کتبات کی مدد سے یہ بتایا گیا ہے کہ جنوبی ہند کے ساحلوں پر اسلام عہد صحابہؓ ہی میں پہنچ چکا ہے تب سے اب تک ملیبار میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر کے ایک ہم عصر مولف زین الدین المعبری نے جو پرتگالی حملوں کے زمانہ کا ایک ممتاز مورخ ہے یہ لکھا ہے کہ اس پورے علاقے میں مسلمانوں پر کوئی مسلمان حاکم نہیں ہے بلکہ غیر مسلم راجہ ہی ان پر حکمرانی کرتے ہیں اور اگر وہ ناجائز افعال کا ارتکاب کریں تو ان پر جرمانے بھی عائد کئے جاتے ہیں لیکن بہر حال اس ملک میں مسلمانوں کو بڑی عزت واقتدار حاصل ہے کیونکہ اس علاقے کی مرفہ الحالی زیادہ تر انھیں کے دم سے ہے مسلمان جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مقامی راجہ ہی ان کے قاضیوں اور موذنوں کی تنخواہ ادا کرتے ہیں اور احکام شریعت کے مسلمانوں پر نفاذ میں مدد دیتے ہیں اور اس کی اجازت نہیں دیتے کہ جمعہ کی نماز ترک کردی جائے۔ چنانچہ نماز نہ پڑھنے والوں کو وہ اکثر شہروں میں جرمانے کی سزا دیتے ہیں (راقم الحروف نے ۱۹۳۹ء میں ایک مماثل چیز ریاست اوندہ میں دیکھی جو مغربی گھاٹ پر ایک مرہٹہ ہندو ریاست ہے۔ یہاں کا راجہ مسلمانوں کا صدر قاضی بھی ہوتا ہے اور جمعہ کی نماز نہ پڑھنے والوں پر وہ اب بھی جرمانہ کرتا ہے۔ کوچین وغیرہ میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق دیکھئے نادر حسین کا مضمون کرسچین کالج میگزین مدراس نومبر و ڈسمبر ۱۹۱۲ء نیز جنوری و فبروری ۱۹۱۳ء) میں اگر کوئی مسلمان کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس پر سزائے موت شرعاً دی جانی ضروری ہو تو مسلمان افسروں کی اجازت سے یہ لوگ اسے سزائے موت

دیتے ہیں۔ پھر اس کی لاش مسلمانوں کے سپرد کردی جاتی ہے جو اسے نہلا کر تجہیز و تکفین کرتے اور نماز جنازہ پڑھاتے ہیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرتے ہیں . . . . مقررہ دس فی صد محصول کے علاوہ مسلمان تاجروں پر یہ کوئی اور محصول عائد نہیں کرتے۔ البتہ اگر یہ افعال ناجائز کا ارتکاب کریں تو ان پر ان کے قوانین کے مطابق جرمانہ کیا جاتا ہے۔ کسانوں اور باغبانوں پر بالکل کوئی محصول نہیں ہے چاہے ان کے قبضے میں کتنی ہی بڑی جائداد کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ مسلمانوں کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوتے چاہے کسی قاتل کو گرفتار کرنے کے لئے ہی کیوں نہ ہو بلکہ وہ صرف مکان کا محاصرہ کر لیتے ہیں اور چوکسی اور بھوک پیاس کے ذریعہ سے اس کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو سپرد کر دے۔ اسلام قبول کرنے کے راستے میں بھی یہ لوگ کوئی روڑے نہیں اٹکاتے بلکہ اس کے برخلاف نومسلموں کے ساتھ ان کا وہی برتاؤ ہوتا ہے جو موروثی مسلمانوں کے ساتھ چاہے یہ نومسلم کتنی ہی نیچ ذات کے کیوں نہ رہے ہوں۔ پرانے زمانے میں مسلمان تاجر آپس میں چندہ کر کے ایسے نومسلموں کی مدد کر دیا کرتے تھے (تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالیین مطبوعہ لزبن صفحہ ۳۵ تا ۳۶)۔

(۸) چین کے متعلق مذکورہ بالا مولف مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خانفو کے ایک چینی افسر نے ایک مسلمان تاجر پر کچھ سختی کی وہ چین کے بادشاہ کے انصاف پر بھروسہ کرتے ہوئے فوراً پایہ تخت پہنچا اور مظلوموں کا معینہ لباس یعنی سُرخ کپڑے پہن کر دربار میں حاضر ہوا جب اسے باریابی ہوئی تو اس نے اپنا واقعہ بیان کیا بادشاہ نے اپنے طور پر تحقیقات کرائی اور خفیہ پولیس کے مختلف افسروں سے جب اس کی توثیق ہوگئی تو خانفو کے افسر کو سزا دی۔ پھر اس مسلمان تاجر کو شاہانہ انعام و اکرام سے نوازکر یہ کہا کہ اگر تم چاہو تو ہم تمھارا پورا سامان اچھے بھاؤ پر لے لیں ورنہ تمھیں اپنے مال کے متعلق پوری آزادی ہے اب تم چاہو تو ٹھیرو جیسا چاہو بیچو اور امن و اطمینان کے ساتھ جہاں چاہو جاؤ (مروج الذہب مطبوعہ یورپ جلد اصفحہ ۳۰۷ تا ۳۱۲)۔

(۹) ایک اس سے بھی قدیم یعنی تیسری صدی ہجری کے مولف نے مزید وضاحت سے لکھا ہے کہ سلیمان تاجر نے بیان کیا ہے کہ خانفو کا شہر تاجروں کا ایک بڑا مرکز ہے وہاں ایک مسلمان کا تقرر مقامی حکومت کی طرف سے اس غرض کے لئے عمل میں آتا ہے کہ وہاں آنے والے مسلمانوں میں آپس میں اگر کچھ نزاعات پیدا ہوں تو ان کا وہ تصفیہ کیا کرے چین کے بادشاہ کی خواہش یہی ہے کہ عید کے موقع پر مسلمانوں کا یہ حاکم نماز کی امامت کرتا ہے اور خطبہ میں سلطان المسلمین یعنی خلیفہ کے لئے دعا بھی کرتا ہے۔ عراق کے تاجر اس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کرتے۔ وہ قرآن اور شریعت کے مطابق ہی انصاف کے ساتھ فیصلے کرتا ہے (سلسلۃ التواریخ یعنی سفرنامہ سلیمان تاجر مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۳ تا ۱۴)۔

(۱۰) بحر خزر (بحر کیاسپین) کے آس پاس رہنے والی قوموں کے متعلق مسعودی نے لکھا ہے کہ علاقہ خزر میں مسلمان سب سے ممتاز لوگ ہیں کیونکہ انھیں پر وہاں کے بادشاہ کی فوج مشتمل ہے یہ لوگ وہاں لرشیہ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ خوارزم سے ترک وطن کرکے یہاں آبسے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ بہت عرصہ پہلے ان لوگوں کے قبول اسلام کرلینے کے بعد ان کے ملک میں ایک قحط پڑا تو یہ لوگ خزر چلے آئے۔ یہ بڑے اچھے سپاہی ہیں اور خزر کے بادشاہ کو ان کی بہادری پر بڑا اعتماد ہے۔ یہ لوگ اس شرط پر وہاں رہتے ہیں کہ ایک تو انھیں اپنی عبادت کھلم کھلا کرنے کی اجازت ہوگی۔ وہ مسجدیں بنا سکیں گے اور اذان دے سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ وزیر انھیں میں سے چنا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ تیسرے یہ کہ اگر خزر کے بادشاہ کو کسی اسلامی سلطنت سے لڑائی پیش آئے تو ان لوگوں کو جنگ پر نہ بھیجا جائے گا۔ وہ کسی بھی دوسری قوم سے لڑنے کے لئے تیار رہیں گے۔ بادشاہ کا محافظ دستہ بھی انھیں لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہاں مسلمان قاضی ہیں۔ علاقہ خزر کے پایہ تخت میں رواج یہ ہے کہ وہاں سات حکام عدالت پائے جاتے ہیں۔ دو مسلمان دو خزری دو عیسائی ایک صقالبہ روسیوں میں سے اور ایک دیگر غیر مسلم جاہل قوموں میں سے ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ اگر کوئی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو

یہ سب اسے مسلمان حکام عدالت سے رجوع کرتے ہیں اور اس بارے میں جو بھی شرعی حکم ہو وہ اسے مان لیتے ہیں ..... ان کی مسجدوں میں بچوں کے لئے تدریس قرآن کے مدرسے بھی ہیں (مروج الذہب طبع یورپ جلد ۲ صفحہ ۱۰ تا ۱۲)۔

چند عام احکام

بہرحال جو مسلمان عارضی طور سے بیرونی ممالک میں جا رہیں ان کے اسلامی فقہ اور اخلاق کی کتابوں میں پر زور تاکید ہے کہ وہ پابند قانون رہیں اور ایسی زندگی بسر کریں جو قابل نمونہ سمجھی جائے۔ نیز وہ اپنے اجازت نامہ سفر کی جملہ شرطوں کا پورا پورا لحاظ رکھیں حتیٰ کہ اگر اسلامی حکومت اور اس حکومت میں جس کے علاقے میں یہ لوگ ہوں جنگ چھڑ جائے تو ان مسلمانوں کو اپنے دوران قیام میں ہر طرح کے مخاصمانہ اعمال اور غداری سے بچے رہنا چاہئے (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۸)۔ انھیں اپنے اجازت نامہ سفر کی جملہ شرطوں کی تعمیل کرنی چاہئے ہاں غداری اور بد عہدی نہ ہوتی ہو تو پھر وہ اگر ممکن ہو تو اپنے ہم وطنوں پر کئے جانے والے ظلم کو دور کر سکتے ہیں (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۸)۔ ایک معاملہ میں اسلامی قانون بہت شدت سے حکم دیتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی مسلمان بیرونی ممالک میں ہوں اور اسلامی مملکت کی رعایا میں سے عورتیں اور بچے (خواہ مسلمانوں کے ہوں یا ذمیوں یعنی غیر مسلم رعایا کے یا باغیوں کے) گرفتار کر کے وہاں لائے جائیں تو ان مسافر مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو اجازت نامہ سفر کے تحت حاصل شدہ حفاظت سے دست برداری دے لیں اور اس کی اطلاع مقامی حکومت کو دینے کے بعد لڑیں اور اپنی ہم وطن عورتوں اور بچوں کو رہائی دلائیں (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۸)۔ عورتوں اور بچوں کے متعلق اس غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں غلامی کا عام رواج تھا اور بڑی عمر والے مرد سپاہیوں کے مقابلے میں ان کا ہمیشہ کے لئے گم ہو جانا آسان تھا۔ لیکن یاد رہے کہ اس میں دو امور وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں، ایک تو اپنی حاصل شدہ حفاظت سے دست بردار ہونے کی پیشگی اطلاع

مقامی حکومت کو دینے اور دوسرے ان عورتوں اور بچوں میں یہ قید نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہی ہوں بلکہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے بھی یہی فریضہ عائد کیا گیا ہے۔

جو مسلمان بیرون ملک میں ہوں انھیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہاں کی مقامی حکومت کی فوج میں بھرتی ہوں، صرف یہ اجازت ہے کہ اگر کوئی ایسا دشمن اس مقام پر حملہ آور ہو جس کے متعلق خطرہ ہو کہ وہ ان کی ناطرفداری کی پرواہ نہیں کرے گا تو پھر اپنی مدافعت کی خاطر ان کو بھی اس جنگ میں ہاتھ بٹانا چاہئیے (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۷ تا ۹۸) اس مدافعت کے سلسلہ میں فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ وہ حملہ آور دشمن چاہے غیر مسلم ہو یا ایسی مسلمان حکومت جو اسلامی مملکت کی باغی ہو ہر حال میں حکم ایک ہی ہوگا (محمد شیبانی کی کتاب الاصل بر موقع)۔ عہد نبوی میں بھی اس طرح کی ایک نظیر ملتی ہے کہ مہاجرین حبشہ کو ایک مرتبہ یہ موقع پیش آیا تھا کہ حبشہ پر نجاشی کے ایک دشمن نے حملہ کر دیا تھا مسلمان مہاجرین دعائیں کرتے رہے کہ نجاشی کو فتح ہو جو غیر مسلم تھا اور وہ اس کے لئے بھی تیار رہتے کہ ضرورت پڑے تو اس کی فوج میں شریک رہ کر جنگ کریں لیکن نجاشی کی فتح کے باعث اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

یہ مختصر تذکرہ ہے جو اس موضوع کے متعلق پیش کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ ارباب علم کے اشتراک عمل سے اس میں آئندہ مزید اضافہ ہو سکے گا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم۔اے۔ایل ایل بی (عثمانیہ)
ڈی لٹ (پیرس) ڈی فل (بون)

مرہٹی ادب بیسویں صدی میں

شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور سے کسی نے پوچھا "اے شاعر زندگی کی شام قریب ہے تمھارے بال سفید ہو رہے ہیں۔ کیا تمھیں تنہائی میں اس کے بعد کے عالم کا کوئی پیغام سنائی دیتا ہے" ؟ شاعر نے جواب دیا۔ شام کا وقت ہے اور میں کان لگائے بیٹھا ہوں کیونکہ دیر سے ہی سہی شائد کوئی گاؤں سے پکار بیٹھے بھٹکتے ہوئے نوجوانوں کے دلوں کے ملن کا میں منتظر ہوں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ دو نگاہیں چاہتی ہیں کہ سنگیت سے ان کی خاموشی توڑ دی جائے اور ان کے لئے کچھ کہا جائے اگر میں زندگی کے کنارے بیٹھ کر موت اور عاقبت کی فکر میں لگ جاؤں تو ان کے جذبات کو گیتوں میں کون گوندھے گا ؟۔ آج ہندوستان کے ادب میں یہی آواز گونج رہی ہے۔ مرہٹی ادب میں ہم کو اس قسم کی آواز سب سے پہلے سترھویں صدی میں سنائی دیتی ہے۔ جب سوامی رامداس نے عوام کو جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کیا۔ ان کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینا سکھایا اس نے اپنی پوری عمر اسی کام میں صرف کردی۔ ملک کی ابتر حالت کا داس بودھ میں اس طرح نقشہ کھینچا ہے "چونکہ جوہر حیات بالکل مفقود ہو گیا ہے اور ملک اجڑ گیا ہے اس لئے بہت سے خاندانوں کو آنے والے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ لوگوں کے پیٹ کو روٹی نہیں۔ تن کو کپڑا نہیں۔ اور مکان بنانے کے لئے مسالہ نہیں یہ اپنے آپ کو کیونکر سنبھالیں گے ہر چیز ہمت شکن اور نفرت انگیز بنی ہوئی ہے۔ امید کی کہیں سے کوئی جھلک ہی نظر نہیں آتی۔ مصائب کا ایک سیلاب ہے سب کو بہائے لے جا رہا ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی سبب سے تکلیف نہ اٹھا رہا ہو۔ میں ایک متنفس کو بھی بشاش نہیں پاتا۔ اور بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی ایک دوسرے کی پروا بھی نہیں کرتا"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں قومی احساس پیدا ہو گیا اور

تھوڑے سے ہی دنوں میں مرہٹے سارے ہندوستان پر چھا گئے لیکن ان کی شومئی قسمت کہ تھوڑے عرصہ میں ان کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس مد و جزر میں ادب کی کشتی بھی ہچکولے کھاتی رہی۔ حتیٰ کہ جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو وہ کنارے آ لگی تھی۔ لیکن زندگی کا وہ دھارا جو رک سا گیا تھا پھر سے بہنے لگا اور یہ کشتی پھر چلنے لگی لیکن اب اس نے اپنے ساتھ بہت سی چیزیں انگریزی دنیا سے لائی تھی اور وہ پھر ان ساز و سامان کو لے کر زور سے بہنے لگی۔ انگریزی اثر جب بڑھتا گیا تو ادیبوں نے بھی اس جانب توجہ کی اس کے تراجم ہونے لگے۔ ہری کیشوجی نے ۱۸۴۱ء میں Pilgrims Progress اور سرو مٹے نے Gulliver's Travel Robinson Crusoe کا ترجمہ کیا۔ جب اس کی مقبولیت بڑھنے لگی تو بنگالی ناولوں کے ترجمے بھی شروع ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اچھی ناولوں کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بابا پدم جی پہلا شخص تھا جس نے اچھی ناول لکھا۔ اس کے بعد ہی ۱۸۶۱ء میں چپ لون کرنے افسانوں کا ایک مجموعہ "چمتکارک گوشٹی" شائع کیا۔ لکشمن شاستری نے "مکتا مالے" ایک اخلاقی ناول لکھا۔

ادیبوں کی توجہ اب ان کی اپنی زندگی پر پڑی، سماج کو انہوں نے دیکھا جہاں ایک اضطراب دکھائی دیا۔ بیواؤں کی چیخ پکار انہیں سنائی دی۔ اچھوتوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ انھیں نظر آئے۔ توہمات ہر طرف حکمراں دکھائی دیئے۔ ان سب کی جھلکیاں ہم کو ہری نارائن آپٹے آنجہانی کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار "کرمنک" سے مرہٹی ادب میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اس میں ان کے افسانے اور ناول شائع ہوتے تھے۔ ان کا مشہور سماجی ناول "می" اسی میں شائع ہوا تھا۔ ہری نارائن آپٹے ایک اعلیٰ درجہ کے ناول نگار تھے۔ ان کا درجہ مرہٹی میں وہی ہے جو بنگالی میں چندر چیٹرجی کا۔ انھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے افسانہ کی راہ بھی سجھا دی۔ ان کے بعد ہی وٹھل سیتا رام گرجرا اور کاشی ناتھ رگھو متر اس میدان میں آ گئے۔ مرہٹی شاعری بھی اس زمانہ کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ ایک شاعر دت نے جو ۱۸۹۹ء کے قبل ہی اس دنیا سے چل بسا تھا ایک لوری لکھی تھی جس میں شاعر ایک غریب گھر کا حال

بیان کرتا ہے۔ ماں بچہ سے کہتی ہے۔"سو جا بیٹے، سورج آسمان سے وداع ہو گیا ہے جیسے کہ بدنصیبوں سے دولت رخصت ہو جاتی ہے۔ اندھیرا آنگن میں چھا گیا ہے، یہ دنیا ایسی سوئی ہے جیسی کہ میری آرزو ہی ہو، گھر بھر میں چوہے ادھر سے اُدھر اناج کے دانے تلاش کرنے کے لئے گھومتے ہیں۔ مگر وہ بھی جلد ہی اس گھر کو چھوڑ دیں گے جس طرح کہ اپنے ناتے رشتہ والوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ پرانی بانس کی گوبر سے لیپی ہوئی دیواریں ہیں اور وہ گھر کی مفلسی سب کو دکھا رہا ہے۔ دروازہ کھلتے اور بند ہوتے وقت 'کرر' بولتا ہے گویا وہ بھی اپنی غریبی کا شکوہ کر رہا ہو۔ دروازوں کی درازوں میں سے تیز ہوا آرہی ہے جو میری لوری سے سُر ملا رہی ہے، سو جا میرے بیٹے سو جا۔"

کیشو سُوت مرہٹی شاعری میں آزادی کا پہلا علم بردار تھا۔ اُس نے مرہٹی میں Sonnets کو رواج دیا۔ اس نے نہایت خوبی سے روزمرہ زندگی کے واقعات اور اس کی خرابیوں کو اُجاگر کیا ہے رسم و رواج کے متعلق کہتا ہے۔"رسم و رواج جہالت سے اپنی غذا حاصل کرکے اور زیادہ نفرت انگیز بن جاتا ہے۔ شاہ راہ فطرت سے منحرف ہو جاتا ہے اور جھوٹ کے تخت پر متمکن ہوتا ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کے بعد بھی لوگ اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ گو یہ شیطانی چیزیں ہیں مگر ان کی دیویوں سے زیادہ تعظیم کیجاتی ہے۔"
بیسویں صدی کے قبل ہی سے مرہٹی ادب کو بھنڈارکر اور راناڈے جیسی شخصیتیں اس کی خدمت کیلئے ملی تھیں اس کے آغاز سے تلک اور گوکھلے نے اپنا قلم سنبھالا۔ تلک نے 'مراٹھا' نامی اخبار جاری کرکے عوام میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی، پروفیسر پرانجپے نے کہانیوں کے ذریعہ سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی آگرکر سماج کی الجھنوں میں لگ گئے۔ کیتکر نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

انگریزی ادب کا ریلا تیزی سے مرہٹی ادب میں آرہا تھا۔ ورڈسورتھ۔ شیلی۔ بائرن۔ شکسپیر وغیرہ کی مختلف نظموں کے ترجمے دھڑا دھڑ ہو رہے تھے۔ اسٹیج پر بھی ایک پردہ اٹھا۔ جب نرسہوں چنتامن کیتکر نے Othelo اور پرنسپل آگرکر نے Hamlet کا ترجمہ کیا۔ اب اسٹیج پر کرلوسکر، کولھٹکر

کھاڈیلکر اور گڈکری جیسے حضرات دکھائی دینے لگے۔ جنہوں نے پرانی کتھاؤں کو ڈرامائی صورت دی تھی اور ساتھ ساتھ اچھے اچھے ڈرامے بھی لکھے تھے۔

پچھلی جنگِ عظیم سے دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ سلطنتوں کے نظام بدل گئے۔ دنیا کے خیالات بدل گئے۔ ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی کا بہاؤ کچھ رُک سا گیا ہے۔ لیکن دنیا پھر تیزی سے دوڑنے لگی۔ اس دوڑتی دنیا کے پاس وقت کم تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مرہٹی ادب میں انگریزی ادب کا دھارا زور سے بہنے لگا۔ اس میں نیا جوش تھا۔ نئی امنگ تھی۔ اس سے ادیبوں کے دل کے کواڑ کھلے اور ان کی توجہ انسان کے دکھ سکھ کی جانب مبذول ہوئی۔ سیاسی تحریکات کا زور شور بڑھتا گیا جب اس سیلاب کی موجیں گاؤں تک پہنچیں تو کسانوں نے بھی کروٹ بدلی۔ مزدور خواب غفلت سے چونک اُٹھے تعلیم کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی۔ عورتوں میں علم کی اشاعت تیزی سے ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب متوسط طبقہ کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔ اس نے جب چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ ایک طرف محل کی غراتی آنکھیں ہیں تو دوسری طرف جھونپڑی کی سسکیاں۔ محل نے کہا۔ ادھر آؤ ہم یہاں سے آرٹ، حسن، نزاکت دکھاتے ہیں۔ جھونپڑی نے پکارا، میری زندگی کو دیکھو۔ یہاں تمھیں مفلسی، جہالت اور توہم پرستی کا راج دکھائی دے گا۔" کسی نے محل میں پناہ لی اور کوئی جھونپڑی کی آواز کے پیچھے بھاگ کھڑا۔ کوئی تعلیم کی اشاعت میں لگ گیا۔ چنانچہ پروفیسر ڈھونڈو نپت کڑے ہمیں عورتوں کی تعلیم کے لئے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں جو آج کروے یونیورسٹی کے روپ میں ہے۔ اور تلک اور گوکھلے سیاست کے میدان میں تیزی سے دوڑتے ہیں۔ آگرکر۔ کولہٹکر سماج سدھار میں لگ جاتے ہیں۔

جب یورپ میں اشتراکیت نے زور پکڑا تو ہندوستان کی نظریں بھی اس پر پڑیں۔ وہ زندگی کے ایسے ہی لائحہ عمل کا متلاشی تھا۔ آزادی کا نعرہ بلند ہوا۔ کسان اور مزدور میدان میں آگئے۔ عورتیں بھی مردوں کا جوا

اتار پھینکنے کے لئے آگے بڑھیں، ہمارے ادیب نے جب ٹالسٹائی، گورکی، ٹراگنیف کو دیکھا تو اس میں اپنا ہی دل دھڑکتا ہوا پایا وہ ادھر بھاگ کھڑے ہوئے، بہتوں نے توفیشن کے طور پر بھی اس کی تقلید کی۔ موپساں اور ہارڈی بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکے۔ ادب میں نئی نئی صنفوں کا رواج ہوا۔ Essays لکھے جانے لگے Sketches کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ شاعری کی ٹیکنک بدل گئی۔ لیکن مرہٹی ادیب کو ان سب سے زیادہ کتھا سندری، پسند آئی نارائن سیتارام راؤ پھڑکے نے جوش شباب میں پریم کی مُرلی بجائی اور اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اس کی چرنوں میں لولا اور دیگر افسانے وتسلا دیگر افسانے پروفیسر پھڑکے کے افسانے کی بھینٹ چڑھائی کھانڈیکر نے اسے خوب سجایا۔ لطیف تشبیہات و استعارات کے زیورات پہنائے۔ شاعرانہ خیالات کی اوڑھنی اوڑھائی۔ اپنے جذبات اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ انسان کی چیر پھاڑ کر کے اس کی حقیقت اُسے دکھائی، اُسے جھونپڑیوں کی سیر کرائی جس سے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس سے کہا۔ دیوی! لو میں تمہارے لئے۔ پوجن، گھر کے باہر، جیون کلا۔ پھول اور پتھر دھوپ اور بارش، دنک و دیگر کہانیاں وغیرہ تحفۃً لایا ہوں۔ ایشونت گوپال جوشی نے کہا، ادھر بھی ایک نظر۔ ذرا سماج کو تو دیکھو، اسی میں کتنی خرابیاں ہوگئی ہیں یہ ہماری زندگی میں گھن کی طرح ہیں۔ سامنت نے اپنے دل کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بوکل نے اسے گدگدی کی اور چٹکی بھی لی۔ چنتامن ونائک جوشی نے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔ لکشمن سرودیسائی اس کے لئے "سمندر کی موجیں"، "جیون دھارا" وغیرہ لائے کوٹھے کرنے سماج کا ڈکھڑ سُنایا۔ چور گھوڑے نے گاؤں کی سیر کرائی۔ کانیکر نے اُسے کھری کھری سنائی' اترے نے تو اسے بہت ہنسایا اور بالآخر اس کے سامنے "برانڈی کی بوتل" ہی رکھ دی۔

اس سندری کو سہیلیوں کی بھی تو ضرورت تھی، جن سے وہ اپنے دل کی بات کہتی۔ ان سے ہنستی، چھیڑ چھاڑ کرتی۔ شریمتی شروا کرنے اس کے گھر جا کر کہلا، اری دیکھ تو ہم کتنی مصیبت میں ہیں۔ ہماری

عمر کے ساتھ ساتھ ہماری تکلیفیں بھی بڑھتی جاتی ہیں اور ان مردوں کو اس کی کچھ بھی پروا نہیں"۔ آنندی بائی شرکے نے اپنا دکھڑا سنایا۔ کملا بائی تلک اور کسماوتی دیسپانڈے نے اپنے قلم کے بل پر کہا "عورتیں بہت کچھ کرسکتی ہیں۔ انھیں مردوں کی رہنمائی کی ضرورت نہیں وہ اپنا راستہ آپ تلاش کرسکتی ہیں"۔ کشما بائی سے اس کی خوب نوک جھونک ہوئی۔ کرشنا بائی جیسی سنجیدہ عورت بھی اس کے ساتھ ہولی۔

اس کے بعد ادیب زیادہ تر دنیائے ناول کی سیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور پھڑکے اور کھانڈیکر ہی ہیں۔ پھڑکے ادب برائے ادب کے قائل ہیں اور کھانڈیکر ادب برائے زندگی کے حامل لیکن تعجب تو یہ ہے کہ کبھی پھڑکے ادب برائے زندگی کے حامل نظر آتے ہیں تو کبھی کھانڈیکر ادب برائے ادب کے قائل۔ چنانچہ پھڑکے کی "سمر بھومی" یا "دولت" کو لیجئے اول الذکر میں "وہ محبت اور فرض" کی جنگ اور دوسری میں دولت اور محبت کی کشمکش کو دل ہلا دینے والے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف کھانڈیکر کے "ہراجنیا" "دو دل" "پہلی محبت" کو پڑھ ڈالئے اس میں جذبات کے فوارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ دونوں متوسط طبقہ کے ادیب ہیں اور زندگی کے ترجمان ہیں لیکن دونوں کے زاویۂ نگاہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ پھڑکے Hedonist ہے اور کھانڈیکر Humanitarian پھڑکے، جادوگر، آشا، مسافر، اناد وغیرہ جیسی اعلیٰ درجہ کے ناولوں کو لے کر محبت کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتا ہے۔ اور کھانڈیکر "الکا" "سفید بادل" "تلاش مسرت" "اور کرونج بدھ" وغیرہ کو لے کر انسانی زندگی کے مصائب کو حل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ پھڑکے عموماً ہر چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔ مگر کھانڈیکر ہر چیز خصوصاً انسان اور اس کی فطرت کا بہت گہرا اور غائر مطالعہ کرتا ہے۔ وہ مجاز کے پردے ہٹا کر حقیقت آپ کے سامنے جلوہ گر کرتا ہے۔ ایک جگہ وہ انسانی اصلاح اور سدھار کے متعلق لکھتا ہے "آپ کو اس کا علم نہیں کہ نیم کا درخت جب پرانا ہوجاتا ہے تو اس میں صندل کی سی خوشبو آنے لگتی ہے جسے ہم اصلاح کہتے ہیں وہ ایسی ہی خوشبو ہے"۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے "یہ اصلاح درحقیقت ابھی ہمارے خون میں سرایت نہیں کی ہے

یہ اُن پھولوں کی طرح ہے جو خود بیل کے نہیں ہیں بلکہ اُس پر چپکائے گئے ہیں جو ہوا کے ایک معمولی سے جھونکے سے گر پڑتے ہیں"۔

اس کے بعد ہم وامن ملہار جوشی کو دیکھتے ہیں ۔جو اپنی اندو بھولی اور سرلا کالی، راگنی۔ اور "سوشیلا کا دیو" لے کر سنجیدگی سے کھڑے ہیں انھیں ہماری اس حالت پر افسوس ہوتا ہے۔غلامی کی زنجیروں کو پیروں میں پڑی دیکھ کر ان کا دل تلملا اٹھتا ہے۔ اخلاقی خرابیوں کو دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں، سوچتے ہیں کہ اس کا حل کیا ہو۔ وہ ایک مفکر ناول نگار ہیں۔جنہیں ماڈکھولکر کے الفاظ میں Family Philosopher کہنا مناسب ہوگا۔ڈاکٹر کیتکر رقت تخیل اور جذباتی دنیا میں غوطے لگاتے ہیں، سماج کو غور سے دیکھتے ہیں۔

گجانن ترمبک ماڈکھولکر کا نتا، مکتا تما، مکھوٹے لے کر ترقی پسندی کی راہ پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔عورتوں کی آزادی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔بھارگو وٹھل ماما وریرکر۔ ودھوا کمار لہریں مارتا ہوا ساگر اور "نہ پوجا ہوا دیوتا" لے کر ہماری زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی فکر کرتے ہیں۔ ان کی صف میں ہمیں سانے گروجی اور دیشپانڈے دکھائی دیتے ہیں۔اس دور میں البتہ شاعری کی طرف کم توجہ برتی گئی۔اس میں گڈکری نے مُرلی بجائی اور بالکوی تو ورڈسورتھ کی طرح پودوں کے ساتھ لہرانے لگے اور پھول، تارے اور جھرنوں میں گانا ڈھونڈھنے لگے۔تانبے نے کہا" زندگی صرف مایوسی کا نام نہیں اور نہ صرف امید کا نام ہے وہ تو آنسوؤں کا پھول ہے"۔ اُس نے کہا کہ دُکھ سکھ انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ قوم کو جگانے کے لئے کہتا ہے" موت سے ہی حقیقی زندگی ملتی ہے۔ پہلے موت، پھر حیاتِ ابدی، پہلے موت سہہ لو، آزادی کی امید رکھو۔پھر موت ہمیشہ کی نیند سو جائے گی اور اس سے امر جیون کی پیدائش ہوگی۔سب لٹا دو تو سب گھر بیٹھے ہی چلا آئے گا۔سب کچھ قربان کر دو تو سب بندھن ڈھیلے پڑجائیں گے"۔ چندر شیکر نے دیہاتی زندگی پر نہایت عمدہ اور جذبات سے بھری نظمیں لکھی ہیں۔مادھو جیولین نے "سدھارک"

نقلی لیڈروں اور سماجی ٹھیکہ داروں کی بڑی عمدگی سے تصویر کھینچی ہے۔ اُس نے عمر خیام کی رباعیات کا بھی مرہٹی میں ترجمہ کیا۔ ایشونت اس دور کا مرہٹی کا سب سے زیادہ مشہور شاعر ہے وہ بڑودہ کا درباری شاعر ہے، پہلے وہ رومانی دنیا کی سیر کرتا تھا لیکن آج کل کسانوں اور مزدوروں کے گیت گاتا ہے، سولوں کو بیدار کرنے کی اس طرح کوشش کرتا ہے " ہلانے ڈلانے سے کیا کوئی بیدار ہوگا؟ صرف دھکا دینے سے کیا ترقی ہوگی؟ اٹھنے کو کہنے سے کیا کوئی کھڑا رہے گا؟ کتھا اور پُرانوں سے کیا عوام میں بیداری پیدا ہوگی؟ اگر تم ملک اور قوم کی حقیقت میں بھلائی چاہتے ہو تو یہ بک بک چھوڑ دو۔ اُن کیچڑ سے بھرے ہاتھوں میں ہاتھ ملا کر بیٹھو۔ یہ بھی تو ہم ہی جیسے ہمارے ہی طرح خون اور گوشت کے بنے ہیں"۔ ان کی 'کاویہ کیریٹ' مرہٹی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آر آر دیشپانڈے چراغ لے کر پیتم کی تلاش کرتے ہیں۔

اننت کانیکر اور بہیرے نے بھی قومی نظمیں لکھیں۔ پواڑے نے Ballads کثرت سے لکھے گئے۔ لیکن ان میں قومی سے زیادہ مہاراشٹری رنگ پایا جاتا ہے۔ اترے نے لوگوں کو خوب ہنسایا۔ لیکن کمال تو یہ کیا کہ کہیں بھی سوقیانہ پن آنے نہیں دیا۔ سانے گروجی اور بیرسٹر ساورکر نے بیداری پیدا کرنے کے لئے انتھک کوششیں کیں سانے گروجی نے کہا "ہم خدا کے مزدور ہیں، ہم وطن کے مزدور ہیں ہم محنت شاقہ کریں گے۔ اپنے کھیت میں کثرت سے پھل، پھول پیدا کریں گے اور افلاس کو دور کریں گے، ہر دے کی کھیتی میں ہمدردی اور محبت کی کیاریاں بنا کر مساوات اور آزادی کے تخم بوئیں گے۔"

اس کے علاوہ گریس۔ کاویہ وہاروی اور دوسرے حضرات بھی اپنے ساتھ اپنی اپنی چیزیں لائے۔ ڈراموں میں سنگیت ناٹکوں کا رواج کم ہوگیا۔ کھاڈیلکر۔ گڈکری۔ کرلوسکر۔ دیوال کی جگہ دوسرے حضرات نے لی۔ پوران کی کتھاؤں کو تمثیلی شکل دینا چھوڑ دیا گیا۔ تاریخی ڈراموں کی جانب بھی کم توجہ برتی گئی۔ قومی اور سماجی ڈراموں کا رواج بڑھتا گیا۔ چنانچہ ورودکر نے کھادی کی ٹوپی، ہندو مسلم اتفاق اور چھوت چھات پر

ڈرامے لکھے۔ دوسرے تمثیل نگاروں میں دو نام ہی بہت مشہور ہیں۔ایک اترے دوسرے وربرکر۔ اترے
اتنا ہنساتے ہیں کہ ہنستے ہنستے دم نکل جاتا ہے۔لیکن اس ہنسی اور مذاق میں بھی کچھ نہ کچھ نصیحت یا پیغام
دے جاتے ہیں۔ اترے ہر چیز کو Universal Experience کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ جو بعض لوگوں کی نگاہ
میں کھٹکتی ہے۔ شادی کی بیڑی، بھرم کا کدو، سا سٹنگ نمسکار۔ ان کے اچھے ڈرامے سمجھے جاتے ہیں۔

وربرکر نے تقریباً اٹھارہ ناٹک لکھے ہیں۔جن میں کنج بہاری اور ایک تاریخی ڈرامہ دل چاہے
سو کرے گا، بہت مشہور ہیں۔ سماجی ناٹکوں میں، سونے کا کلس، اور حکومت کے غلام بہت مشہور ہیں۔
ان کے ڈراموں میں رنگینی بہت کم ہوتی ہے۔ برنارڈ شاہ پر تنقید کرتے ہوئے کلیٹن ہیا لمٹن نے کہا ہے کہ
Eine writing does not make dramatic literature لیکن اسی کے باعث
وہ مہاشٹرا میں اتنے مقبول نہیں ہیں جتنا کہ انہیں ہونا چاہئے تھا۔ ایک ایکٹ کے ڈراموں کا رواج
اب بڑھتا جارہا ہے۔کانیکر۔ بھاگوت وغیرہ نے چند اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔اس کے بعد ہم Essays
کی جانب آتے ہیں۔ ان میں تین نام قابل ذکر ہیں۔ پھڑکے، کھانڈیکر، کانیکر، پھڑکے کی "سرگوشیاں"
دیکھ ڈالئے ان کی نظر زیادہ تر سطحی ہی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کھانڈیکر کی "شام چاندنی میں" ہوا کے
جھونکے" پر ایک نگاہ دوڑائیے وہ یہاں بھی انسان کے دل کی گہرائیوں میں جاتے ہیں اور من کے چور کو
پکڑ لاتے ہیں۔ کانیکر کے "ٹوٹے ہوئے تارے" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھری کھری ہی سنانے کے
عادی ہیں۔

مرہٹی ادب ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ کیتکر نے اسی صدی میں مرہٹی انسائیکلو پیڈیا
ترتیب دیا۔ سردیسائی جیسا مورخ اسی زبان کی خدمت کر رہا ہے۔ اور جاوڈے کر جیسا ادیب بھی اسی زبان
میں موجود ہے۔ افسانہ نگاری و ناول نگاری میں وہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں۔ افسانہ
نگاری کے میدان میں صرف کھانڈیکر کا نام لینا ہی کافی ہوگا جس نے اب تک ڈھائی سو (۲۵۰) سے

زیادہ افسانے اور بارہ ناول لکھے ۔ مرہٹی میں اس کا وہی درجہ ہے جو بنگالی میں سرت چندر چیٹرجی ۔ یا ہندی میں منشی پریم چند مرحوم کا' ناول نگاری میں پھڑکے کا نام ہی کافی ہوگا ۔ جس کے اب تک ۱۶ ، ۱۷ ۔ ناول منظر عام پر آچکے ہیں ۔ مزاحیہ نگاری میں اترے جیسا بلند پایہ ادیب موجود ہے جس نے افسانوں ڈراموں اور شاعری میں ہنسی کے فوارے چھوڑ دیے ۔

ایک چیز ہماری نظر میں بہت کھٹکتی ہے ۔ اور وہ شاعری ہے مرہٹی شاعری اس سرعت کے ساتھ ترقی نہیں کر رہی ہے جس طرح کہ ارد و، ہندی، گجراتی، بنگالی کا حال ہے ۔ غالباً اسکی وجہ اس کی ٹکنیک ہے ۔ شاعری میں زیادہ تر مقامی رنگ پایا جاتا ہے ۔ اس میں ہم کو قاضی نذر الاسلام اور جھویر چند میگھانی (گجراتی کے مشہور انقلابی شاعر) کی سی گرج سنائی نہیں دیتی ۔ دوسری چیز قابل ذکر یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے تراجم نہیں ۔ یورپین زبانوں کے تو کافی تراجم ہیں ۔ لیکن اپنے ہی گھر سے زیادہ غفلت' بے خبری پائی جاتی ہے ۔ ہندی میں منشی پریم چند کے چند افسانوں اور ایک دو ناول کے ترجمے ہوئے ہیں ۔ جینند کمار جو ہندی کا مفکر افسانہ نگار ہے اس کے صرف ایک ناول تیاگ پتر کو مرہٹی میں منتقل کیا گیا ہے ۔ ٹیگور کے چند افسانوں کا بنگالی سے ترجمہ کیا گیا ہے ۔

سرت چندر چیٹرجی کے ناول' شری کانت '، کاشی ناتھ وغیرہ کا ترجمہ وریر کرنے کیا ہے گجراتی کے مشہور ناول نگار رمن لال دیسائی کے صرف دو ناول مرہٹی میں منتقل ہو چکے ہیں ۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اردو کے چند افسانوں کے سوا اردو کی کوئی چیز مرہٹی میں منتقل نہیں ہوئی ۔ اردو سے یہ غفلت حیرت انگیز ہے ۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں بھی ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اعلیٰ تنقیدی ادب کا فقدان ہے ۔

مرہٹی ادب کا سیلاب اب شہر سے گاؤں کی طرف لے جا رہا ہے ۔ جہاں کھانڈیکر اور الیشونت تعلیم یافتہ حضرات کو گاؤں جانے کا پیغام دیتے رہے ہیں ۔ اس میں اب بھی بڑی رجحانات

عام طور پر پائے جاتے ہیں جو ٹیگور نے اپنی کتاب City and Villige میں ظاہر کئے ہیں۔ "ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ دیہاتی زندگی کی ندی کی تہ میں جو جھاڑ جھکاڑوں اور کوڑا کرکٹ سے بھر گئی ہے اور جس میں بہاؤ نہیں رہا۔ خوشی اور مسرت کا سیلاب لائیں اور اس کام کے لئے ہمیں عالموں، شاعروں، مصنفوں اور آرٹسٹوں کی متحدہ کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ سب مل کر اپنی اپنی بھینٹ لائیں گے۔ اگر یہ لوگ ایسا نہیں کرتے تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ جونک کی طرح ہیں جو دیہات کے باشندوں کا جیون رس چوس رہے ہیں۔ اور اس کے بدلہ میں انھیں کچھ بھی نہیں دے رہے ہیں" ؛

امجد علیخاں یوسف زئی

بی۔اے متعلم ال۔ال۔بی (عثمانیہ)

قطعہ

محبت میں ہستی مٹاتا چلا جا محبت کی لذت اٹھاتا چلا جا

محبت سے بڑھکر نہیں کوئی مذہب حدیث محبت سناتا چلا جا

محمد علی نیّر

روسو کا ایک رومانی خط

جین جیکس روسو (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) فرانس کا مفکر ادیب تھا اس نے بہت سی انقلابی چیزیں لکھیں میڈم ڈی وارنس سے اس کی ملاقات تھی اور اُسی کی وساطت سے اس نے تھریسیا واشیو سے ملاقات کی جو بڑی حسین دوشیزہ تھی۔ اس کے بطن سے اُسے پانچ بچے ہوئے۔ چند دنوں بعد اس کی ملاقات کاونٹس صوفیہ سے ہوگئی۔ اور روسو اس کی محبت کا غیر معمولی دم بھرنے لگا۔ ذیل کا مکتوب کاونٹس صوفیہ ہی کے نام ہے جو جون ۱۷۵۷ء میں لکھا گیا۔

"صوفیہ۔ جلد آؤ تاکہ میں تمھارے بے رحم قلب کو چکنا چور کردوں میں اب کس لئے ٹھہر جاؤں۔ جب کہ تم نے حقیقی زندگی کو مجھ سے چرالیا ہے۔ کس طرح میں تمھیں عیش و آرام سے زندگی گزارنے دوں کہ عیش خود مجھ پر حرام ہوگیا ہے کاش تم اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے قلبِ حزیں کو خنجر سے بھونک کر مجھے ہمیشہ کے لئے نجات دلادیتیں۔ لیکن تمھاری یہ سرد مہری اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوگئی ہے تم ہی سوچو کہ پہلے میں کیا تھا اور اب کیا ہوں تم میرے کرب و اضطراب کو اس وقت ہی معلوم کروگی جب تم مجھ سے ملوگی۔ جب سے تم نے مجھے یہاں بھیج دیا ہے میں جاں بلب ہوچکا ہوں۔ میری تمام قوتیں معطل و بیکار ہوگئی ہیں نہ دماغ ہی کچھ کام کرتا ہے اور نہ کسی چیز کی اچھی اور بُری ہونے کی تمیز کرسکتا ہوں اور نہ جسم ہی میں کچھ قوت باقی ہے حقیقت میں یہ تمام چیزیں تم نے مجھ سے چھین لی ہیں۔ آخر تم نے یہ کھیل کب تک کھیلنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ تم مجھ ہی سے شکایت کرتی ہو کہ میں تم سے ناراض ہوں یہ کیسے ممکن ہے صوفیہ۔ تم میری کتنی قدر کرتی تھیں۔ آہ صوفیہ۔ تم اس دوست کو شرمندہ نہ کرو۔ جو تمھاری نظرِ التفات سے

گھائل ہو چکا ہو تم اپنی خاطر میری اُمیدوں کا خون نہ کرو میں کسی کی ملکیت نہیں ہوں لیکن کیا تم نے مجھ پر قبضہ نہیں کر لیا ہے؟ اس سے تو تم خود بھی انکار نہیں کر سکتیں اور جبکہ میں خود کو تمھارے حوالے کر چکا ہوں تو مجھے اجازت دو کہ میں ہمیشہ تمھارا ہی ہو رہوں۔ ان دنوں کا خیال کرو جب کہ ہم اپنی زندگی مسرّتوں میں گزار رہے تھے۔ کتنے سُہانے دن تھے وہ۔ آج اُن کا خیال کرتے ہوئے دل بیٹھا جاتا ہے۔
پہلے پہل ایک معمولی محبّت کا شعلہ دکھائی دیا تھا جو زندگی میں آہستہ سے سرایت کر رہا تھا اور جس نے بعد میں عقل، ہوش و حواس پر قبضہ کر لیا حتّٰی کہ میری زندگی خود سراپا محبّت بن گئی۔ تمھارے جذبات بھی میری قربت سے کتنے برانگیختہ ہو جاتے تھے اور جب کبھی میں تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا تو تمھارے دل کی حرکت تیز ہو جاتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنی حدّت تم میں منتقل کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ جب کہ ہم آبشار کا دلفریب منظر دیکھ رہے تھے اس وقت تم نے ہی کہا تھا کہ "میں ہی ایک ایسا آدمی ہوں جو بڑی دلچسپ بحث کرتا ہوں۔ تمھاری طرزِ گفتگو، تمھاری حرکات و سکنات ایسی ہیں کہ میں انھیں ظاہر نہیں کر سکتی۔ تمھاری طرح شاذ ہی کوئی انسان اس طرح محبت کر سکے۔" یہ میری کتنی بڑی کامیابی تھی۔ اس کا اقرار اور خود تمھارے لبوں سے۔ ہاں یہ حقیقت تھی میرے ہی وہ جذبات تھے جن سے میں تمھیں اپنا سکا۔ او صوفیہ! ان مسرّت انگیز لمحات کا خیال ہمیشہ دل کو ستاتا ہے۔ گھبراہٹ کے بعد ایک پریشانی سی ہونے لگتی ہے۔ کیا تم بھول گئیں کہ تمھاری بڑی بڑی آنکھیں جب مجھ سے چار ہوتی تھیں تو خود بخود تمھاری نظریں نیچے جھک جاتی تھیں۔ کیا وہ مفتوحانہ نظریں نہ تھیں؟ کیا تم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں محبّت کا پیغام نہیں دیا تھا؟ اب مجھ میں برداشت کی قوت نہیں رہی۔ خدا جانے کشمکش اور آزمائش کی یہ گھڑیاں کب ختم ہوں ——— تمھارا روسو

مجید یوسف زئی
متعلم بی۔ اے (آخری)

"دو سیکلیں"

(طبعزاد افسانہ)

حویلی والی سڑک پر دو سیکلیں چلی جا رہی تھیں۔ آپس میں باتیں کرتی ہوئی "چیں چوں" "دکیں کوں"۔ دونوں کی حالت خراب تھی۔ ایک میں اس کے مالک نے تیل نہیں ڈالا تھا اور دوسری کے پیڈل تیزی سے گھوم نہیں سکتے تھے۔ اپنی چند دردناک چیخیں اور دردناک آوازیں فضا میں بکھیرتی ہوئی وہ چلی گئیں۔ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

سورج آدھا ڈوب چکا تھا۔ سیاہی پر کہیں کہیں کرنوں کے اداس سائے تھرک رہے تھے۔ پرانی حویلی کے ویرانے میں بیٹھا ہوا میں ان دو سیکلوں کی آوازوں پر غور کر رہا تھا۔ جیسے میں ان آوازوں کا مطلب سمجھتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری صبیحہ اور ہماری فیروز دونوں دو بائیسکلیں تھیں۔ دونوں زندگی کے راستے پر سے گزر رہی تھیں۔ اسی طرح "چیں چوں"، "دکیں کوں" کرتی ہوئی۔ میں ایک بائیسکل پر سوار تھا اور دوسری ــــ میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اسی طرح بڑھا چلا جا رہا تھا ــــ نہ جانے کدھر!

" ابا مجھے بھوک لگی ہے"

" ہاں جی! آج دوسرا دن ہے فاقہ کا ــ خدا نہ کرے میری بچی ...... سورج ڈوب

چکا تھا۔ سڑک ناہموار تھی۔ پیر پیڈل سے پھسل جاتے تھے۔ مگر میں چلا ہی جا رہا تھا۔

"اللہ کیسا تیز بخار ہے میری بچی کو"

"میں دوا لاؤں گا۔ آج چاہے جو بھی ہو جائے"

بازار کے ہنگاموں میں ـــــ شہر کی بلند عمارتوں میں ـــــ دواخانوں اور تجربہ گاہوں میں مسیحا نفس ڈاکٹروں کے گھروں میں ـــــ رات آدھی بیت گئی ـــــ میری بچی! راستہ نہیں دکھائی دیتا ـــــ چلا جا رہا ہوں۔

"ملی دوا؟"

"ہاں یہ لو"

قریب کہیں کسی کی شادی ہو رہی تھی۔ قہقہوں کا ایک جھونکا آبی لہروں کی طرح ہوا کے طوفان اٹھاتا ہوا گذر گیا۔ جھونپڑے کا سہارا ایک دیا تھا سو وہ بجھ گیا۔

"زہر ـــــ موت!"

"ہاں زہر ـــــ مجبوروں کی دوا ـــــ چلو صبیحہ کہیں دور ـــــ بہت دور ـــــ ایسی جگہ جہاں کوئی ہماری بے بسی اور بے کسی پر ہنسنے والا نہ ہو۔ جہاں کے رہنے بسنے والوں کو ہمارے خون کی ضرورت نہ ہو۔ جہاں ہم چین کی موت مر سکیں ـــــ چلو نا صبیحہ!"

رات ڈھل چکی تھی۔ بادلوں کا لشکر تیزی سے کسی ایک طرف بھاگا بھاگا جا رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ قریب ہی میں گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ آسمان سے خون برسے گا۔ قانون اور لوہے کے دیوتا اسی خون میں نہا کر اپنے ہزاروں لاکھوں گناہوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

آگے بہت بڑا چڑھاؤ تھا مگر میں ہارا نہیں۔ نس نس کی قوت لگادی۔ "ہاتھ والی سیکل" کا ساتھ چھوٹنے کے بعد سے اب میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ اب میں دونوں ہاتھوں سے ہینڈل کو مضبوط پکڑ کر پیروں اور سینے کا پورا زور لگا سکتا تھا۔ سیکل آگے بڑھ رہی تھی۔

" احمد نے دیئے ہیں یہ روپیے، آؤ کھانا کھالو نا"

" احمد نے!"

" ہاں ہاں تم احمد کو نہیں جانتے ارے وہ تو یہیں کہیں رہتے ہیں؟"

" احمد ــــ یہیں کہیں رہتے ہیں!!"

" اجی وہ داڑھی والے ــــ تم نے نہیں دیکھا اُن کو پرسوں یہاں؟"

" اوہ! لاؤ کھانا"

پرندوں کی آواز گھر کے دبیز پردوں سے ٹکرا کر تھرّا رہی تھی ــــ " پھٹ"

چڑھاؤ ختم ہوا ــــ مگر یہ پنچر!

دُور سے مؤذّن کی آواز سنائی دی جس میں عبودیت کے عجز سے زیادہ تقدس کا زعم ملا ہوا تھا ــــ " اللہ اکبر"

" ــــ اللہ اکبر ــــ"

" اللہ اکبر ــــ صبیحہ خدا حافظ"

" خد ــــ آ ــــ حا ــــ فظ"

صبح ہوگئی۔ آسمان میں کہیں سوراخ پڑ گیا تھا۔ ہوا کے لشکر باغی درختوں کا سر جھنجوڑ کر انہیں سجدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ جو اللہ والے تھے وہ تو پہلے ہی سے جھک گئے تھے۔ بعض تو جڑ پیڑ سے اکھڑ کر فنا فی اللہ بھی ہوگئے تھے۔

سانپ زہر پھیلایا ــــ اور رینگتا ہوا چلا گیا ــــ اُف! صبیحہ بھو کی عصمت۔ اب آستین خالی تھی۔

" کری ری، رن، کری ری رن، کری رن"

کالج کے نوجوان ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکلے تھے ۔ مگر میری بائیسکل !

پھر وہی دو سیکلیں جو کل شام اِدھر سے گذر گئی تھیں ـــــ آپس میں بات چیت کرتی گذر رہی تھیں ۔ اب میں ان کی باتوں کا مطلب تو نہ سمجھ سکا ــــ رہ کیا گیا تھا سمجھنے کے لئے ! ہاں سواروں کے اُترے ہوئے چہروں پر جلی حروف میں لکھا تھا کہ وہ اپنی ایک شب کی دلہن کے گھر کرایہ کے مکان تھے ۔ دھنسی ہوئی آنکھیں پکار رہی تھیں کہ "میں نے یہ دیکھا اور وہ دیکھا" بے زبان ہاتھ پیر گڑگڑا کر خدا سے معافی مانگ رہے تھے کہ "پھر ایسا نہیں ہوگا" اور پچکے ہوئے گال کہہ رہے تھے کہ "غبارات اُڑ چکے ہیں" ....

....

دونوں سیکلیں گذر گئیں ۔ اپنی کرخت آواز سے فضا کو مسموم کرتی ہوئیں ۔ کتنی بُری چیز ہے یہ مشین بھی !

افضل عابدی

آہنگِ نو

رنگین خیالات

مولوی فضل الرحمن صاحب بی، اے (آنرز) ناظم محکمۂ نشریات لاسلکی کی یہ جدت آفریں نظم لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد کے غیر معمولی مشاعرے منعقدہ ۱۲ بہمن ۱۳۵۲ف میں جس کا افتتاح ڈاکٹر والاشان شہزادہ (شجیع عثمانیہ) کے کلام بلاغت نظام سے کیا گیا تھا، داد وتحسین کے ہجوم میں پڑھی گئی تھی۔ خیال کا متاثر کن پس منظر، حقائق کی شاعرانہ تعبیریں، اسلوب بیان، جدت، زبان کی شیرینی اور ترکیبوں کی دلکشی اس نظم کی چونکا دینے والی خصوصیات ہیں۔ (نیرؔ)

جب ظلم کے بادل چھاتے ہیں اور غم کا سماں دِکھلاتے ہیں

جس وقت اندھیری دُنیا پر لعنت کے پَرے منڈلاتے ہیں

(۲)

چلتے ہیں ستم کے تیر جہاں بہتے ہیں لہو کے فوّارے

بیداد فلک کے خنجر جب سنسار کا دل تڑپاتے ہیں

(۳)

جب آگ کی بارش ہوتی ہے جب موت سے سازش ہوتی ہے

دھرتی کے اکھاڑے میں انساں شیطان صفت بن جاتے ہیں

(۴)

نومیدی کی آخر سرحد سے ملتے ہیں امیدوں کے ڈانڈے
اس وقت اندھیری دنیا میں رنگین خیالات آتے ہیں

(۵)

رنگین خیالات آتے ہیں اور خلق کا دل بہلاتے ہیں
چاہت کا سندیسہ پہنچا کر راحت کے ترانے گاتے ہیں

(۶)

پھر امن کے سپنے دکھلا کر سُکھ چین کی سُندر بنسی پہ
تقدیر کی ماری دُنیا سے من موہنی گت بجواتے ہیں

(۷)

آزادی کا ہونٹوں پر نغمہ خوش حالی کا کانوں میں مژدہ
جو راگ بھی دل کو گرمائیں وہ راگ الاپے جاتے ہیں

(۸)

جب ظُلم کے بادل چھاتے ہیں اور غم کا سماں دکھلاتے ہیں
اُس وقت اندھیری دُنیا میں رنگین خیالات آتے ہیں

محمد فضل الرحمٰن بی۔ اے

جوانی

(لاسلکی نشرگاہِ حیدرآباد کے غیر معمولی مشاعرے منعقدہ ۱۲ بہمن ۱۳۵۳ف میں
یہ نظم نشر کی گئی تھی)

خودی کی تیغ جوہردار چمکانے کے دن آئے
یقیں کا پرچم انوار لہرانے کے دن آئے

نئی صبحیں، نئی راتیں، نئے جلوے، نئی دنیا
حیاتِ نو کے نغمے جھوم کر گانے کے دن آئے

فروغِ آرزو، یہ ولولے، یہ عزمِ بے پایاں
تمناؤں کے رنگیں جام چھلکانے کے دن آئے

مذاقِ زندگی بدلا، نظر ہے اوجِ گردوں پر
ستاروں کی حسیں محفل میں کھو جانے کے دن آئے

نشاط و کیف کی امواج ہیں رقصاں رگِ جاں میں
شعاعِ مہر کی مانند اٹھلانے کے دن آئے
کہاں ساقی، کدھر کا مے کدہ، جام و سبو کیسا
بلا صہبا و ساغر مست ہو جانے کے دن آئے
حدودِ بزمِ گیتی سے نگاہوں کی ہے زد آگے
فضائے دو جہاں پر یعنی چھا جانے کے دن آئے
نہ فکرِ بیش و کم ہے اور نہ جبر و قدر کی پروا
شرابِ شوق پی کر ناز فرمانے کے دن آئے
ستاروں کو، فضاؤں کو، ہواؤں کو، زمانے کو
تڑپ کر موج کی مانند تڑپانے کے دن آئے
فضائے دل پہ ہے چھایا ہوا احساسِ آزادی
ہر اک آئینِ پابندی کو ٹھکرانے کے دن آئے

محمد علی نیر ایم۔ اے (آخری)

دست برداری

(Mynel کی سانٹ Renouncement پڑھنے کے بعد)

یوں تو دن بھر میری تخئیلوں میں لہراتے ہو تم — میری ہر مصروفیت کے ساتھ یاد آتے ہو تم

تم مہکتے ہو مری ہر لرزشِ انفاس میں — خون بنکر دوڑتے ہو تم رگِ احساس میں

لیکن اک اک سے چھپاتی ہوں میں اپنے دل کا راز — یعنی گھبراتی ہوں کوئی کر نہ بیٹھے کچھ سوال

بے خیالی میں یہ چہرہ زرد ہو جائے کہیں — آنکھ سے ظاہر دل کا درد ہو جائے کہیں

زیرِ لب غزلیں تمہاری گنگنا سکتی نہیں — چھپ کے تنہائی میں دو آنسو بہا سکتی نہیں

سارا سارا دن اسی الجھن میں ہوتا ہے تمام

ایک اک لمحہ اسی دھڑکن میں ہوتا ہے تمام

ختم ہو جاتا ہے لیکن جب دن آ جاتی ہے رات
رفتہ رفتہ جب خموشی بن کے چھا جاتی ہے رات

لیٹتی ہوں اپنے بستر پر میں ہو کر خستہ حال
دور ہو جاتا ہے میرے ذہن سے ہر اک خیال

ہولے ہولے تم چلے آتے ہو میرے دل کے پاس
دھیرے دھیرے ناؤ لگ جاتی ہے یہ ساحل کے پاس

دوڑتی ہوں بے تحاشا تم سے ملنے کے لئے
مضطرب گلشن کی کلیاں جیسے کھلنے کیلئے

دور ہو جاتا ہے ڈر دل کھول کر روتی ہوں میں
بوجھ ہو جاتا ہے ہلکا اسقدر روتی ہوں میں

تم ہی تم ہوتے ہو پھر اور رات کی تنہائیاں
پر لگا لیتی ہیں اُف تخئیل کی آزادیاں

علی احمد
بی اے ـ (عثمانیہ)

نوائے شاعر

کیا ہے عشق کو ہستی کا پاسباں میں نے
نگاہِ برق کو سونپا ہے آشیاں میں نے

حقیقتوں کی درخشانیوں پہ رکھا ہے
لطیف پردۂ رنگینیٔ بیاں میں نے

کسے خبر کہ محبت کی لہر دوڑا کر
رگِ حیات میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

ملی نہ مفت متاعِ غمِ نہاں مجھ کو
دیا ہے اس کے عوض عیشِ جاوداں میں نے

سنا ہے برق مجھے آزمانے والی ہے
بنا کے پھونک دیے کتنے آشیاں میں نے

وفورِ غم میں بھی لب نالہ ناشناس رہے
جلا کیا پہ نہ اٹھنے دیا دھواں میں نے

ثبوت اس کا ہم آہنگیٔ جہاں دے گی
اڑائے پرچمِ الفت کہاں کہاں میں نے

بنائے دیر و حرم بے دریغ پڑنے لگی
وفورِ شوق میں سر رکھ دیا جہاں میں نے

مری نگاہ سے تصویرِ کائنات میں رنگ
بقائے حسنِ دو عالم کا راز میری امنگ

سیّد نور محمد نور اکیلوی متعلم سالِ سوم

"رات"

بہت دور تھی مجھ سے دنیائے خواب — تصور میں ہو جس طرح ماہتاب
ہوائیں تھیں خنکی میں لپٹی ہوئی — فضائیں تھیں مستی میں ڈوبی ہوئی
ستاروں کی افشاں تھی بکھری ہوئی — حسیں چاندنی کچھ تھی نکھری ہوئی
خموشی کی چھائی ہوئی تھی گھٹا — نگاہوں پہ تھا نیند کا آسرا
پریشاں خیالات کا تھا ہجوم — ہوں جیسے بساطِ فلک پر نجوم
بہت دور سے آ رہی تھی صدا — دکھی جیسے ہو کوئی گاتا ہوا
دیا چھیڑ اس نے ربابِ خیال — اٹھا جس سے طوفانِ ماضی و حال
تصور کی دنیا مچلنے لگی — مری شمعِ دل غم میں جلنے لگی

یہ سب کچھ تھا رفعت سکوں ہی نہ تھا
محبت کو ذوقِ جنوں ہی نہ تھا

سلطانہ عزیز رفعت بی۔ اے (آخری)
کلیۂ اناث جامعۂ عثمانیہ

"دکن میں عیدیں اور تہوار"

کہیں محفل سجائی جا رہی ہے
تمنّا مسکرائی جا رہی ہے

کہیں رنگین قشقے ہیں جبیں پر
کہیں اک بانکپن روئے حسیں پر

کہیں بہکے ہوئے دلکش نظارے
کہیں جذبات کے رنگیں اشارے

نشیلے بام و در کھوئے ہوئے سے
خوشی کی گود میں سوئے ہوئے سے

گلے ملتے ہیں وہ شیخ و برہمن
دکن ہے علم و آسائش کا مسکن

ابلتے ہیں رواداری کے چشمے
مچلتے ہیں وفا داری کے نغمے

تخیّل کی نئی آبادیاں ہیں
یہاں مذہب کی وہ آزادیاں ہیں

دسہرہ ہو کہ، ہو شامِ دیوالی دکھاتے ہیں سبھی رنگیں جمالی
خوشی آتی ہے صبحِ عید بن کر نشاط و عیش کی تمہید بن کر
یہی جوہر ہیں بس انسانیت کے شریکِ حال ہوں اک دوسرے کے
سبھی مل کر خوشی کے گیت گائیں محبّت کی نئی دُنیا بسائیں
یہ عیدیں اور یہ تہوار کے دن خلوص و چاہ کے اور پیار کے دن

بہاریں مُسکراتی ہیں چمن کی
بڑی رنگین ہیں عیدیں دکن کی

امیر احمد خسرو
(عثمانیہ)

سوز و ساز

غزل

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ دبستانِ داغؔ کے ممتاز ترین علمبردار ہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی سادگی و پرکاری، وہی زبان و محاورہ کی چاشنی، وہی طرزِ ادا کی شوخی بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے جو داغؔ کا مخصوص رنگ ہے۔ نواب صاحب کی یہ غزل سالِ نو کے مشاعرے میں جو بزمِ اُردو جامعۂ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام موصوف ہی کی صدارت میں ۱۵؍ آذر ۱۳۵۳ف کو منعقد کیا گیا تھا، پڑھی گئی تھی۔ (دبیرؔ)

ان کی نگہ سے جب نگہِ بے اثر ملی — دل کی خبر ملی نہ جگر کی خبر ملی

پیمانِ ترکِ ہوش پہ ساقی کے ہاتھ سے — پیمانہ کیا ملا سندِ معتبر ملی

وارفتگانِ عشق کا دُشوار تھا سُراغ — یہ راہ پیچ دار نہ ملتی مگر ملی

وابستۂ سبب ہے کرم ہو کہ ہو ستم — طرزِ عمل سے اپنی یہ مجھ کو خبر ملی

جاتا ہوں کوئے غیر میں صحرا کو چھوڑ کر — کیسی خبر الٰہی یہ وحشت اثر ملی

کیونکر ادا ہو شکر و سپاس عطاءِ عشق — داغِ غمِ فراق مِلا چشمِ تر ملی

دُنیا کے گرم و سرد کا خوگر ہوں اس قدر — آرام جانتا ہوں اذیت اگر ملی

چشمانِ تر نے فیض کا دریا بہا دیا — اشکوں کا تار کیا بندھا سلکِ گہر ملی

مجھ ناتواں پہ نالۂ شب کا تھا اتہام — مشکل سے آج رخصتِ آہِ سحر ملی

اک برقِ تیز رَو مری آنکھوں میں پھر گئی — دل سے نہ دل ملا نہ نظر سے نظر ملی

دُنیا کی حرص و آز سے اکتا گیا تھا دل

آخر عزیزؔ فرصتِ زادِ سفر ملی

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

غزل

جناب میر حسن صاحب نے اپنے افکار کی بنیاد عصری میلانات پر رکھی ہے اور روایتی موضوع و آہنگ سے گریز کر کے غزل کی امکانی وسعت کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے۔ اگر اس رنگ کو فروغ دیا جائے تو غزل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو سکتا ہے اور اس کی فضا پھر چمک سکتی ہے۔ (دیرؔ)

بہ اندازِ نو اک جہاں بن رہا ہے
زمیں پر نیا آسماں بن رہا ہے

فلک کے ستایوں کے دن پھر رہے ہیں
قفس کی جگہ آشیاں بن رہا ہے

ہر اک نوع کی بندشیں اٹھ رہی ہیں
ہر اک بے زباں با زباں بن رہا ہے

نئی راہ پائی ہے انسانیت نے
نئی طرز کا کارواں بن رہا ہے

میر حسن
ایم اے (عثمانیہ)

غزل

(لاسلکی نشرگاہِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منعقدہ عید الضحیٰ کے مشاعرے مورخہ ۴؍ بہمن ۱۳۵۳ف کا افتتاح اس غزل سے کیا گیا تھا)

جستجوئے سکوں نہ کر انجمنِ حیات میں
زمزمۂ سکوں کہاں بربطِ کائنات میں

عشرتِ بے پناہ سے جھوم کے ہمکنار ہو
بادۂ حسنِ یار ہے جلوۂ کائنات میں

عشق ہی وجہِ زندگی عشق ہی لطفِ زندگی
نغمۂ عشق چھیڑ کر دیکھ ربابِ ذات میں

ہے مری فطرتِ بلند تشنۂ کیفِ آگہی
منزلِ زیست ہے کہاں جادۂ کائنات میں

کتنا لطیف گام ہے قافلۂ حیات دوست
ملتے نہیں ہیں نقشِ پا عرصۂ کائنات میں

عشق کے گیت گائے جا نیرؔ درد آشنا
عشق کی مے لنڈھائے جا خمکدۂ حیات میں

محمد علی نیرؔ ایم اے (آخری)

غزل

تری بہکی جوانی ہنس رہی ہے
سبو میں ارغوانی ہنس رہی ہے

پھر اُن کی چشمِ مصروفِ کرم ہے
پھر اپنی بدگمانی ہنس رہی ہے

لب و چشم و جبین و زلفِ خنداں
جوانی کی جوانی ہنس رہی ہے

شراب اس رنگ سے چھلکی میں سمجھا
کسی کی نوجوانی ہنس رہی ہے

یہ ہم نے رکھی بنیادِ نشیمن
وہ برقِ آسمانی ہنس رہی ہے

فریبِ جاوداں میں رہنے والے
نگاہِ عمرِ فانی ہنس رہی ہے

وصیؔ یہ کس سے مل کر آ رہے ہو
جبیں پر کامرانی ہنس رہی ہے

وصی احمد ایم اے (عثمانیہ)

غزل

دل ہی کو شکیبا کر لیتے گر جرأت بیجا کر نہ سکے
اخفائے تمنّا ہو نہ سکا اظہار تمنّا کر نہ سکے

ہے ننگِ محبت ایسی وفا اتنا بھی نہ جو ہم میں کس بل
جو زیست کی بازی کھیل کے بھی اک شخص کو اپنا کر نہ سکے

کیا تم سے کہیں دنیا والو چھوڑو بھی ہمیں جس حال میں
یہ راز ہے جسکا ان سے بھی اس راز کو افشا کر نہ سکے

وہ اور انھیں غم دنیا کا اللہ رے اُن کا عذرِ کرم
ہم خونِ جگر پینے والے یہ زہر گوارا کر نہ سکے

اے وائے مآل عجز و وفا سر ہے کہ کہیں جھکتا ہی نہیں
اک بندے کے ٹھکرائے ہوئے اللہ کو سجدہ کر نہ سکے

اب اپنے سے لینگے اک اک ایذائے محبت کا بدلہ
چاہیں گے ہر ایسے انساں کو جو چاہ کا بدلہ کر نہ سکے

برہم ہے قتیلِ دیوانہ سمجھائے کوئی دیوانے کو
ہاں حسن اسی کو کہتے ہیں جو عشق کی پروا کر نہ سکے

حفیظ قتیل
ایم اے (عثمانیہ) متعلم پی۔ ایچ۔ ڈی

غزل

قلبِ جہانِ زیست میں ذوقِ خودی ہی جب نہ ہو — کاہشِ سعی و فکر کیا؟ جذبۂ دلگداز کیا؟

کشمکشِ حیات ہی وجہِ فروغِ کائنات — محفلِ دار و گیر میں سازِ سکوں نواز کیا؟

شوقِ فزوں طلب ہی خود پردہ کشائے راز ہے — حوصلۂ نیاز کیا؟ ولولۂ نماز کیا؟

میرے ہی ذوقِ دید کی ہیں یہ کرشمہ سازیاں — جلوۂ بے حجاب کیا؟ تابشِ حسن راز کیا؟

میری جوان شورشیں مایۂ صد بہار ہیں — گلشنِ زرنگار کا حسنِ بہار ساز کیا

زاہدِ حیلہ ساز اب چھوڑ دے اپنی حُجّتیں

بادہ کشِ عمل ہوں میں مسئلۂ جواز کیا؟

لطیف ساجد
متعلم سالِ سوم

غزل

ترے دَر سے جبیں میری نہ سرکی
تجلّی بن گئی ہے رہ گزر کی

ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں سے
کشش ہے یہ زمیں ہی کے قمر کی

لئے جاتا ہے جذب کوچۂ دوست
مجھے حاجت نہیں ہے راہبر کی

خدا جانے اثر کیا تھا فغاں میں
ہوئی حالت دگرگوں بحر و بر کی

کبھی تڑپا کبھی رُویا شبِ غم
کہوں کیا کس طرح میں نے سحر کی

لگی ہیں سوئے درکب سے نگاہیں
جھلک پیدا ہُوئی نورِ سحر کی

مزاج اچھا تو ہے اس مہ جبیں کا
کہ بدلی سی ہے کچھ صورت قمر کی

ہوئے جس طور پر بے خود کماں آپ
وہ تھی پہلی تجلّی اس نظر کی

رحیم الدّین کمال متعلم بی، اے (آخری)

کلیہ کی خبریں

امتحان مقابلہ اس سال جامعہ کے ایک ہونہار فرزند حامد معین الدین ایم۔ ایس سی۔ ایچ۔ سی۔ ایس کے مقابلہ میں دوم آئے۔ یاد ہوگا کہ مسٹر حامد معین الدین نے ایم۔ ایس سی میں اول درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ جامعہ کی نیک نامی اور شہرت ان ہی فرزندوں سے وابستہ ہے۔ ہم ان کو اپنی دلی مبارک باد دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ نظم و نسق کے ہر شعبے میں جامعہ عثمانیہ کے فرزند جامعی زندگی کے بلند مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہیں گے۔

معلوم ہوا کہ مسٹر شاہد علی خاں بی۔ اے عثمانیہ بحیثیت مجموعی دوم آئے لیکن اتفاق سے صرف سائنس میں کامیابی کے لئے چند نشانات کی کمی کے باعث منتخب نہ ہو سکے۔ ہم کو مسٹر شاہد کی اس اتفاقی ناکامی سے گہری ہمدردی ہے اور اس امر کا پورا یقین رکھتے ہیں کہ آئندہ مقابلہ میں ان کا نام سر فہرست رہے گا۔

تحصیلداری اس سال تحصیلداری کے انتخابات میں بھی جامعہ کے حسب ذیل فرزند منتخب کئے گئے۔ ہم ان سب کو اپنی اور جامعہ کی جانب سے دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

شاید اس موقع پر یہ توقع ظاہر کرنا نامناسب نہیں کہ جدید حیدرآباد کے تعمیری خاکہ کی کامیابی کا بہت کچھ دارومدار ان فرزندان جامعہ کے ہاتھوں میں ہے جو نظم و نسق کے کسی نہ کسی

شعبے میں بااختیار عہدہ پر فائز ہیں۔ ہر جامعی جدید فرزند کو جدید حیدرآباد کی تعمیر میں ہم آواز ہونا چاہئے یہ فرض خواہ نظم ونسق کے کسی شعبے میں اقتدار حاصل کرکے ادا کیا جائے یا عمومی زندگی کے کسی مجاذبے توسط سے۔ اس قسم کے ظاہری فرق وامتیاز کو اہمیت دینا ہم عثمانیئن کے شعار کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کا قومی زندگی کے کسی شعبے سے تعلق ہو۔ لیکن وہ جدید حیدرآباد کی تعمیر میں اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس دن کو دیکھنے کے آرزومند ہیں جب کہ عثمانیئن قومی زندگی کے ہر شعبے میں کامراں اور کامیاب نظر آئیں گے۔

تحصیلداری کے لئے منتخب ہونے والے برادران کے نام ذیل میں درج ہیں۔

مسٹر کے۔ آر۔ ریڈی بی۔ اے (عثمانیہ) مسٹر محمد عبدالوہاب ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) مسٹر غلام غوث خاں ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) مسٹر سید صیا بی اے (عثمانیہ) مسٹر محمد بن علی باوہاب بی۔ اے (عثمانیہ) مسٹر فیاض الحق بی۔ اے (عثمانیہ) مسٹر اسد علی سعید بی۔ یس سی' ال' ال بی (عثمانیہ) مسٹر سید حبیب الدین احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

جدید انتخابات

اس سال بھی انجمن اتحاد کی عدم موجودگی کے باعث طلبہ برادری کی اجتماعی سرگرمیاں بڑی حد تک بند رہیں۔ اجتماعی شعور کا مظاہرہ ذیلی بزموں کے انتخابات میں ہوا اور گزشتہ سالوں کی نسبت اس سال ذیلی بزموں کے انتخابات میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لیا گیا۔ ان میں سے بعض بزموں کے انتظامی مجلسوں کے اراکین کے نام اور روئدادیں وصول ہوئی ہیں۔

بزمِ اردو

بزم اردو کے سالِ گزشتہ انتخابات عمل میں نہیں آئے۔ لیکن اس سال ڈاکٹر زور نے انتخابات میں خاص دلچسپی لی اور منتخب کابینہ اس گہری توجہ اور دلچسپی کی شکرگزار ہے۔

صدر۔ سید واجد علی صاحب واجد متعلم بی۔ اے (آخری) نائب صدر۔ محمد شمس الدین صاحب صدیقی اصغر متعلم بی۔ اے (آخری) معتمد محمد مصلح الدین صاحب متعلم بی۔ اے (آخری)

کتب خانہ دار منظور احمد صاحب مدنی متعلم بی۔ اے (ابتدائی) خازن چودھری عبدالسلام خاں صاحب متعلم بی۔ اے (آخری) رکن اعزازی۔ محمد علی صاحب تیر۔ ایم۔ اے (آخری)

بزم فلسفہ نتیجۂ کابینہ کا جلسۂ کرسی نشینی بتاریخ ۱۰ آبان ۱۳۵۲ف جناب قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عہدہ داران بزم کے تعارف کے بعد محمد قدرت اللہ صاحب منتخب صدر بزم نے فلسفہ کے قدیم و جدید رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے جامعہ میں تجرباتی نفسیات کے شعبہ کو قائم کرنے کی تحریک کی۔ صدر بزم نے خاص طور پر انجمن اتحاد کی تجدید پر زور دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ نے (۔۔۔۔ اقدار) پر ایک گراں قدر مقالہ پڑھا۔ جناب نائب معین امیر جامعہ نے اپنی تقریر میں تجرباتی نفسیات کے شعبہ کے قیام کا وعدہ فرمایا۔

اس بزم کے لئے حسبِ ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ محمد قدرت اللہ صاحب۔ نائب صدر غلام محبوب صاحب انصاری۔ معتمد مسٹر وینکٹ راؤ صاحب۔ کتب خانہ دار سردار علی صاحب الہام۔ خازن مدکر شاہ صاحب۔

بزم تلنگی صدر جناب سبا راؤ صاحب۔ نائب صدر جی رام چندر راؤ صاحب۔ معتمد سیش راؤ صاحب۔ خازن کے۔ ہاسوامی گپتا۔ مدیر ڈی۔ ایم ششنکر راؤ۔

اس بزم کی سرپرستی میں تقریری اور تحریری مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ بیرون جامعہ مقررین کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ ایک تلنگی مجلہ کی اشاعت زیرِ غور ہے۔

بزمِ تاریخ اِس بزم کے انتخابات کی مہم بھی پوری سرگرمی سے جاری رہی۔ اور نتیجۂ کابینہ نے کرسی نشینی کے جلسہ میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کو پیش کیا۔ اس بزم کی سرپرستی میں متعدد تقریری جلسے منعقد ہوئے۔ مباحثوں سے طلبہ کی تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُردو مباحثوں کے علاوہ انگریزی مباحثہ کا بھی انتظام

کیا گیا تھا۔ شعبۂ تاریخ کے علاوہ دیگر برادران جامعہ کو بھی شریک کرنے کی کوشش کیجاتی رہی ہے۔
اس بزم کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔
فصیح الدین صاحب صدر۔ خورشید علی خاں صاحب نائب صدر۔ مقتدر علی شریف
صاحب معتمد۔ عبدالمجید خاں صاحب کتب خانہ دار۔

کھیل اور اسپورٹس

توجہ دہانی کے باوجود روئداد عدم وصول ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے ورزشِ جسمانی کی حاضری لازمی کردی گئی ہے اس لئے طلبہ کا اسپورٹس اور ورزشِ جسمانی کے نگراں کار اصحاب سے ربط بہت زیادہ قریبی ہوگیا ہے۔ شائد نائب معین امیر جامعہ کے ان الفاظ کو دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے کہ برادران جامعہ کو حاضری کی پابندی کے ساتھ متعلقہ اصحاب کے شخصی تماس اور خوش خلقی سے ترغیب دی جائے گی۔ ہم یہاں یہ بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قاعدہ اور قواعد کے علاوہ انسانی رجحانات کو اخلاق و کردار کی تربیت میں خاص دخل پہنچے۔ خصوصاً جامعہ میں شخصی ربط اور تعلق کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہم لیقین کرتے ہیں کہ متعلقہ اصحاب اس ذاتی وابستگی کی پوری اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے برادران جامعہ کو پوری سہولتیں بہم پہنچائیں گے۔

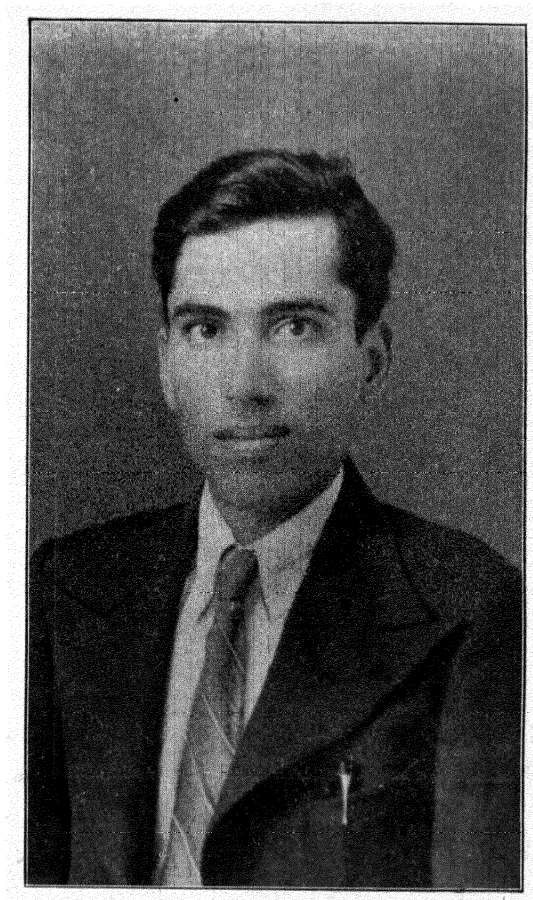
یہ امر ہمارے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ اس وقت شعبہ کھیل و اسپورٹس کے متعلقہ نگار کار اصحاب دلچسپی اور انہماک سے اپنے فرائض انجام دیرہے ہیں۔ مسٹر عبدالستار، مسٹر شریف حسین، اور مسٹر ثناء اللہ ہماری مبارک باد کے پورے مستحق ہیں کہ انھوں نے کھیل اور اسپورٹس میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر عبدالستار برادرانِ جامعہ میں ہر دلعزیزی ان کی خوش خلقی کا آئینہ دار ہے یہ برادرانِ جامعہ کو ہر جائز سہولت بہم پہنچانے کے علاوہ اپنے فرائض بھی پوری مستعدی سے انجام دیتے ہیں۔ ہم کو توقع ہے کہ ان کا یہ طریقۂ عمل آئندہ بھی جاری رہے گا اور برادرانِ جامعہ میں ان کی ہر دلعزیزی بڑھتی رہے گی۔ ہم شعبۂ کھیل کے متعلقہ کارکن سے ایسی ہی ہمدردی اور خوش خلقی کی توقع رکھتے ہیں۔

رحیم الدین کمال ظہیر آبادی



مسٹر محمد عبدالرؤف (عثمانیہ)

مسٹر رؤف جامعہ عثمانیہ کے آتش نوا موسیقار ہیں - انہوں نے نغموں کی دنیا میں نہایت قلیل مدت میں غیر معمولی شہرت حاصل کرلی ہے ان کی شعلہ نوائی گرمئی بزم کو دوبالا کرتی ہے



Mr. ABDUR RASHEED SUBHANI, B. A. B. E. (OSMANIA)

Mr. Subhani is a very popular Ex-Vice-President of the Engineering College Union, who has been appointed in the University and also selected the editor of the Engineering College Magazine, which has been started this year.

beseechingly stretched his hands towards it. And lo! Once more a victorious squeak issued from the long nail over which the sword was hung where a hungry mouse was intent on gnawing the string. When he lifted his head the eclipse was over and the triumphant moon's rays caught the point of the blade giving it an angry malevolent look of a man in a great rage. The eye was open but it had a triumphant leer in its expression.

* * * * *

The thin cotton string, already gnawed by a hungry rat could not bear the heavy weight of the weapon and it fell on the protruding neck of the penitent like the sudden flash of lightning or the swift descent of an eagle on its prey. His neck was almost severed from his body and he lay there in the last agonies of death in an ever-increasing pool of dark blood, and in that same instant the sword falling point downwards, stood quivering in the floor, an ugly thing that gleamed evilly. Over the house a silence and a shadow hung, inexplicable, unfathomable. And not another sound disturbed the quiètude of the house, save the quick, dull, thud of a body falling down and the soft gush of oozing blood. After that came a heavy silence................and a sudden sense of cold in the air, as the swift passing of the shadow of Death.

F'RUZ MEHTA, B.Sc.,

over the precipice, and, the simple tribesmen who later found him dead in a deep ravine, thought this to be a meré accident. Life is cheap amongst the tribes.

But now he hated himself for the mean despicable robbery of the dead. The sword was the only decoration of his unfurnished house. The soft touch of the slanting beams of the moon made it shine, like the morning star. The whole picture rose before his mind's eye like the figure of some terrible Avenging Angel.

The sublime quietude of the night was broken by the sudden hoot of an owl. Mohammad lay rigid, the blood in his veins jumping with every throb of his heart till it seemed to shake him from head to foot. He involuntarily shivered and again his eyes shifted to the silvery blade of the sword. His eyes were glued to a spot where the rays of the rising moon illuminated it. The plaintive cry was swallowed up and lost in the darkness—but as he listened with every nerve strained and every sense on the alert he heard an answering echo issuing from the sword. Indeed the spirit of Khan was calling out for the blood of the murderer. The sound chilled him to the marrow and he already felt the cold hand of death at his throat. As he gazed at the feeble shaft of light, a shadow passed over it, and he was once more thrown into comparative darkness. To his distorted imagination it seemed that the eye was closed, the vital spark of life in him was extinguished. It must be a passing cloud or was it that the old Naga had already begun its repast on the sweet moon. Had the Lunar eclipce already set in, had his moment of departure come?

With the plaintive cry of a tormented soul he rushed forth towards the baleful, vindictive weapon and

How strange that his thoughts did not for one single moment dwell on them but only revolved round a particular rock where he and a stalwart young Afghan, Kalu, his bosom friend, sat, discussing a grave problem, talking of the sterner duties of life.

Anon he heard their voices rise in anger as the true, honest Kalu, urged the impetuous young Mohammad to to leave his crooked ways of life, not to play the despicable part of a spy against the Sirkar who paid him handsome pension. But it was of no avail. Mohammad was adamant in his determination to continue receiving the pension and at the same time to continue playing the part of an 'agent provocateur' distributing arms and ammunition amongst the tribes, instigating them to dacoity and rebellion. He could plainly see Kalu's frank open face seriously perturbed at seeing his resolution. This was too much for the honest, brave soul who remained true to his salt. He had no wish to play the part of a 'Namak Haram' and with his innate decency, he candidly told his former friend that however great a regard he might have for him it was his painful duty to inform the Sirkar about his nefarious activities. Mohammad knew enough of him to know that he meant what he said and would carry out his threat, thus eternally ruining his present propects. Finally he saw himself doing the last terrible act, when, with a short, quick, fierce movement of a desparate savage he hurled a big stone at his friend with diabolical strength. It caught Kalu unaware between the eyes resulting in an instantaneous death. Ah! how his blood gushed forth like the vein of a well gurgling deep in the earth. His sword was too good a prize to be lost, so after relieving him of this burden, a souvenir of the dead, he kicked him

Soon the curve took the shape of a lower lid, and as he looked on it. slowly resolved itself into a big terrifying eye, the eye of the fakir,—glistening, gleaming, glittering like a beam of light, a red tongue of fire or a flash of lightning—a veritable Black Angel of Death. It rooted him to the spot, hypnotised him and bound him by invisible chains far stronger than the strongest pair of handcuffs. By the smouldering fires of the eye under the soft light of the moon dark memories were aroused from their sleep like souls on the wide field of resurrection and the past once more turned to life and he fell a—dreaming.

Truly it was a night to dream in, a white night, full of the moon and the magic of the moon. And so staring at the ugly gleam on the blade, which had assumed the shape of a gigantic eye, he dreamed about the past and the future. He dreamed of a particular piece of black rock, a veritable stone of sorrow, beside a winding pathway in the bleak ranges of the Sulaiman, beneath a starlit, beautiful sky. On this rock he and Kalu sat, talking earnestly, and the soft caressing wind whispered by. Those two figures in his dream did not talk nor did he dream of their glorious childhood, when as children, they used to walk hand in hand, climbing steep uplands, plunging down precipitous slopes, playing hide-and-seek in the gloom of forests, skiping blithely in the wind-swept hills with their curls afloat in the early morning breeze, matching their strength against each other, their innocent cries and hiccups evoking strange, weird echoes from the surrounding hills—a melody of joy and sorrow, of laughter and tears, like the greater melody of Life.

around him was already brimful of shadows which, as he watched, seemed to assume fantastic shapes. He quickened his steps and soon reached home.

At last he reached his red-bricked, unimposing little house in the midst of others like it. It relieved him to see the cluster of houses after the present mental anguish. They seemed more homely, more earthy, more solid than the unreal, ghostly heights of the hills.

He ate his frugal meals and tried to sleep. For the first time in his life, he found that even sleep had deserted him. So taking courage in both hands, he sat in a corner, waiting for sleep and—the Ghost.

Darker and darker grew the evening shadows,—but still he sat in his corner, solemnly considering his strange fate, and forgot his bed. Soon a misty white glory arose out of the gathering blackness, the moon, pallid yet brilliant lifted her strangely sorrowful face over the bleak hill tops and cast a silvery reflection on the grass below. It was a mournful, almost spectral night, as he grimly waited for Kalu's shade. The rising moon cast the magic of her pale loveliness upon the world, and sitting there in a dark corner, he glanced round about him and through the casement at the outside world with an eye that strove to take in the beauty of all things—of hedge, and tree, and winding road, the sheen of water, and the far, soft sweep of hill and dale. Over all these his glance lingered yearningly, for it seemed to him that this look might be the last.

Anon the slanting rays of the rising moon, passing through the open casement, gleamed evilly upon the curved, heavy, long blade of a sword hung on a nail.

the Ninety and nine Names of Allah he would cheat death. He would sleep like a log. And he did.

Death! Why think of it amidst life? The very thought of it chilled him to the marrow. He had a great desire to show a pair a clean heels and it needed an effort of will ere he could curb the panic in him. With an increased pace he walked on through the shadows, past trees that were not trees and bushes that were not bushes; but frightful phantoms, rather lifting menacing arms above his head, and reaching after him with clutching fingers. Ghosts! He suddenly fancied he heard a step behind him, the heavy step of Kalu; he swung round on his heel, with ready stick; but the road stretched away empty as far as he could see Ghosts! Everything was ghostly, the heights of the mountains in the gathering dusk, the goblin-like bushes and spectral rocks. Ghosts!

Why, the road was full of them, they crowded upon his heels, they peered over his shoulders, he felt them brush his elbows, and heard them gibber at him from the shadows. All along the way he was haunted by the glittering eye of the Fakir.

And the sun was setting already! But just before sinking it rose again an instant above the horizon, and like a gignatic molten diamond it flashed forth a beam of light............he stood transfigured in its last rays. It looked like the finger of fate guiding him to his predestined goal.

Involuntarily he hastened his steps but the sun had set ere he reached Dera-Ghazi Khan. Yes, the sun had set, encompassing the Universe in twilight, the space

Djins, Boots and Pareets in the holy book? Since Kalu was dead there must be Kalu's shade. Let him be. But what really interested him was the question: Would the ghost take the trouble to drag him along, against his will, to his own ethereal, intangible shady abode beyond the terrestrial, tangible world of his, as predicted by the fakir? Would a shade, without a body, actually kill him? Would he....................

Suddenly he stooped in his walk. An incredulous expression spread over his face. The fakir had said so, but how in the name of his father the Devil did he know of the little affair on a dark night? Had he any secret power or was it mere guess-work? He must make sure of it at once. Where was the man with the glittering eye? He retraced his steps but the old fakir was nowhere to be seen. Where could be have gone in ten minutes' duration? He seemed to have disappeared into thin air. Or was he, could he be, the ghost? He felt an odd chill as of cold water running down his back and beads of perspiration stood on his brow.

With a hunted expression in his eyes he tried to compose his thoughts. Could there be no escape from death? Was his fate sealed? Should he accept his fate lying down because an old, doddering fool had said so? Was there in him no wish, no determination, to live? By all means, any man with an ounce of brain would prefer life te death. But the question was—was there any chance?

Yes! Why not? Suddenly a smile spread on his lips as he remembered the last words of the Fakir. What had the old fool said? "Beware! If thou wishest to cheat death then sleep the sleep of the just. Begone." Yes, by

Frontier. Evidently the meagre pension paid by the Sirkar was not sufficient to keep his big body, and, mean, little soul together.

"Yes, your days are numbered." The voice of the mendicant cut short his reveries.

"When, tonight, the Naga shall devour the moon and encompass the Universe in sudden darkness, then the spirit of Kalu will awake and stride forth to wreak its vengeance on thee. Beware! If thou wishest to cheat death, then sleep the sleep of the just. Begone."

By now Mohammad Khan was thoroughly frightened and did not wait for a second bidding, but, immediately started for home. Gone was the cynical, come-what-may expression from his face as he hurriedly strode forth in the glory of the setting sun. His brain was in a whirl, there was a lump in his throat which he tried to gulp but could not as he made vain efforts to sort out the past events.

Death on the day of an eclipse of the moon—that, too, at the hands of a ghost! He did not feel like dying. Death had great terrors for him. To be killed on a battle-field or even by the sharp steel of an enemy was something different from the cold, uncanny murder by the spirit of a murdered person.

Could it be that ghosts really existed or were they the creation of a vivid imagination? All this talk of ghost was pure illusion, an eye-wash and mere moonshine to delude and strike fear in the hearts of the weak and the fickle. Revenge of a ghost—pshaw! What true Believer could allow himself to think of, let alone believe in, such folly? Still why not? Did they not speak of

with a strange foreboding. He stooped low and looked with a fascinating interest at a break in one of the lines on his palm which a shrivelled old finger was pointing to him.

On lifting his head he found his companion regarding him with a curious expression on his face. A strange, cruel smile played on his thin lips, and to his distorted vision, it seemed as if his long, bony, crooked nose had taken a further tilt towards the right cheek bone.

The deep sonorous voice continued :—

"Thou shalt not die an ordinary death; thy body shall be sacrificed for the atonement of thy sins. Thou oweth thy life to Kalu, thy former friend, whom thou murdered in cold blood on this very spot, exactly a year ago to the very day".

Mohammad Khan gave an involuntary start, almost a jump, and stared, as the old fakir spoke the dark past. No one knew that Kalu Khan was murdered by him. It was all so very simple. A dark night, a heavy stone and a push over the hill, and no one was the wiser. Poor fools, they thought that Kalu had accidentally slipped down the precipice. Served him right too, the sneaking rogue. Played the spy on him, Mohammad Khan, the Waziri, the secret agitator of the tribes. Well! not a bad job, serving the great Khan from the far-off Germania and befooling the Sirkar. They paid well, those foreigners, and the guns they distributed amongst the tribes for the coming Jehad,—a Holy War for the establishment of a Pan-Islamic Empire and the overthrow of the power of the infidel in India—were as good as the looted rifles from the outlying, far-flung, lonely posts on the Indian

Men Have Their Exits . . . .

A BIZARRE STORY OF INDIA'S FRONTIERS.

THE slanting rays of the setting sun flaming with august fires, lit up a bleak old mountainous track. The winding pathway was empty except for two persons squatting comfortably beneath a bush. A more ill-assorted pair could hardly be imagined. Mohammad, tall and handsome, square-shouldered, deep-chested with an air of jaunty, devil-may-care rakishness on his rather cynical face, seemed visibly perturbed. His companion, quite his opposite in outward appearance—an emaciated body, extremely thin and bony with a big beard wholly incompatible with his exterior and a long drooping nose set very much to one side was saying something in earnest with a good deal of gesticulation—giving his robust companion the 'creeps'. By his attire he looked like a wandering fakir, but what really distinguished him were his eyes, indeed they were a remarkable pair of eyes—glittering and hypnotic with a fixed gaze, like a flashlight intent on looking through his acquaintance's very soul, rooting him to the spot and trying to read his innermost thought.

'Yes Mohammad; I see thee at the end of thy journey, and the time hath come for thee to take the big jump across the beyond. There is a distinct cut in the line of Life. Art thou prepared for it?" asked the old fakir, after silently observing the dimly discernible lines of the big Afghan's red palm in the struggling rays of the setting sun. The cynical Afghan's eyes sparkled

Abyssinia. Later in 1938 Germany captured Czecho-slovakia. All these small countries were deprived of their freedom and a war was let loose upon the peaceful world.

In conclusion we can say that the discoveries of science if used in the proper way lead to the happiness and prosperity of man, if abused they lead to the destruction and ruin of man. So that science can be a blessing as well as a curse to humanity.

ASAF ALIKHAN,
II Year Arts.

propaganda. News is distorted and broadcast. For in stance, after a bombing raid it is announced that there had been the loss only of a few cups and saucers. Can we believe this?

Science has made man sceptical.

People take delight in killing their fellow beings and great importance is attached to those countries which have advanced in the art of war. The saying that "Battlefields have become altars and Hitlers have become Archbishops" has been proved.

There are many things by which we are benefitted but do not know what they really are. For example, Electricity was discovered and harnessed for our use. But alas, science has taught us to use electricity for the destruction of mankind.

Science has encouraged warfare. If we cast a glance at the pages of History we shall see how wars were fought from time to time.

Asoka after the 'Kalinga War' was so shocked by the useless bloodshed of his fellow-beings that he vowed never again to wage war. But his own sons and succesors started them over again. Harsha also after waging many wars became a Buddhist and gave up his ambitions of further conquests. But even these noble efforts proved a failure. The various international leagues established at different times failed to assure peace in the world.

The League of Nations formed on the 20th of January 1920 failed in 1936 when Italy pounced upon

Another useful invention is the Radio. We can well imagine the number of days Marconi, the great Italian scientist must have toiled to acheive the goal. It was sheer perseverance which brought him success.

We can hear the voice of the people who are thousands of miles away from us. We can appreciate the beautiful music of the great artists and hear the speeches of great men in every walk of life.

The Refrigerator is another great invention. It has great utility specially in the hot season. All vegetables and fruits are kept fresh and cool. Puddings and ice-creams can be prepared with great ease.

The scientific inventions for which scientists toiled arduously to benefit humanity have brought about wars and massacres—nothing but chaos.

Innumerable planes are sent out to bomb the enemy targets. Millions of innocent lives perish and still more perhaps are left ruined. Factories are damaged, railway bridges are blown up, houses are demolished and cottages disappear. So much of one's labour proves worthless and all the hopes of a peaceful life are shattered.

It is Science which has made man pugnacious and has made warfare brutal. Gallantry and bravery are at a discount.

All these inventions help nations to destroy others, help one soldier to kill another and thus destroy humanity. The Radio has become an instrument for

" Science and Human Happiness."

EVERYTHING can be judged in two ways. It may be useful in some ways and useless in others. And the same is the case with Science. Science progresses rapidly, specially in the days of war. Nowadays the country which has the ablest scientists is considered the most powerful. Courage and valour do not count in these days.

Science has made travelling easy. People instead of travelling on foot or on horse-back or on camels, make journeys in trams, trains, motor cars, ships and aeroplanes, and thus economise time. In olden days, travelling was considered very unsafe because people were always afraid of being looted by dacoits, plunderers and marauders. The invention of modern means of travel has minimised danger. One can travel throughout the world without much danger of being looted or kidnapped. One can sit comfortably smoking a pipe or a cigarette.

The beautiful scenery, the fresh air, the sweet scented breeze would certainly enhance the pleasure of travelling. One feels cheerful when one rushes past at full speed casting a glance over the various scenes of nature, the swaying of trees, the sunset of gaudy hues when the world is clad in crimson and gold or the night with a million stars.

to fight but serve, a soldier not to destroy but to construct, a soldier not to spill so much blood of his fellow creatures but to put so much blood into his fellow beings as to resuscitate them, a soldier whose weapons are not guns and rifles with lethal cartridges but love and sacrifice with service.

G. V. SUDHAKARA,
V Year Arts.

All is showy and tawdry. It is divorced from Nature, from its blessings and beatitudes. Simplicity and decency have quit tne city in shame and horror. Everywhere there is unrest, there is uneasiness; vexations and anxieties have become a matter of course. The people seek escape from them in the theatres, in the cinema, in the Hotels but find no rest or peace of mind. In short there is neither the warmth nor the depth of life.

One evening Rabhira sits in his room with "Leaves from the Jungle" by Verrier Elwin, the book he got as a gift from his professor. He is tired and exhausted because of his hunt for jobs, but he is in quiet and tranquillity of mind. He skips the pages. Suddenly he sees a photograph of two tombs of a German and an American missionary in the midst of the thatched huts of the aboriginals of Central India. The picture murmurs something-audible only to those who care to know what it says. It speaks of love which transcends all geographical limits and boundaries, it speaks of service which extends itself without being solicited, it speaks of sacrifice which says that it knows not what it is. The voice of the picture reverberates in the inner recesses of Rabhira's heart and in the back of Rabhira's mind. In the echo of the voice Rabhira hears that he has a purpose to fulfil, a function to discharge, not in the office but by the side of forlorn villagers, not in the midst of tumult and turmoil of the city but in the peace and tranquillity of the village, not with the avarice and superfluity of city life but with contentment and simplicity. Rabhira could no longer remain in the city. The city had lost its glamour for him. In the hierarchy of life he is a soldier at his post in the village—soldier not

of his mother Durga. Rabhira is dumb-founded, words fail him. He simply follows her to his father's bed-side, but when they reached he was already dead, he who had sacrificed the peace and tranquillity of the village of his birth only because he had pinned his hopes on Rabhira, he who had travelled to the city only to groan under the oppressive weight of poverty and vexation and in the end to have none at his bed-side, even the son, even the wife to utter, the parting words. The same evening Rabhira's mother too fell a victim of that monstrous pestilence. Neither he nor the doctors nor anybody else could save her. The parents departed from the world before they could realise their only ambition in life: to see their son prosper in the world Rabhira was heavy at heart................
He took the Examination and received the Bachelor of Arts degree. It was now for him to come on the stage of the world and play his role. He was left all alone to face the struggle of life. He had to fight single-handed. Now he applies for a post in the government. For the interviews he required to maintain all the modes and formalities, all the artifices and makeshifts. Yet of what avail? He had no rich and influential relatives, no recommendations and no letters of credence. He tramps from office to office in quest of some service. "No Vacancy" stares him in the face, peons at the doors of the offices halt him. He looks into the "wanted" column of the newspapers. But only first class and second class graduates are needed. In his search for jobs Rabhira puts his hand on the pulse of the city. There is so much disparity, so much in-congruity. If there are men who wallow in riches, there are also men in no less negligible number who grovel in the dust; buildings are palatial and spacious but the huts in the slums are squalid and noisy. The life is full of artificiality, full of makeshift.

won a scholarship that relieved the burden of the family to an extent. The same year Rabhira appeared for the entrance examination and to his credit he topped the list. But Rabhira had to solve the problem of his future. Till now, all had gone well. He had his father to think for him, to decide for him; now he should think for himself. He would certainly proceed to higher studies.

Rabhira joined the college with some difficulty. The life here was different, but he was not unhappy. He received respect and welcome from every side. No wonder, he had stood first in the Entrance examination. The fellow-students respected him, they whispered to each other 'He is first class'. Lecturers felt delighted to know his merit. Very soon Rabhira had a lot of friends. He is the very cynosure of the college. But he begins to feel something peculiar, something quaint within, him. He could not afford the fashions of the college life obviously because his parents were poor; they could only get him the minimum necessaries of life. In the inner recesses of his heart a strange feeling toward his parents developed. Many a night he passed with his friends at the cinema, at the theatre and in his friend's house. The parents waited impatiently for his return at night often in vain. But they had the same love, the same affection for their son; nay, their love, their affection is ever on the increase.

Three years elapsed. Rabhira had passed the Intermediate examination but not in the first rank, and he was now in the 4th year, the final year of his college life. One day sitting at his books late in the night at his friend's house, Rabhira hears a faint and distant voice 'Your father longs to have a last glimpse of you, he is dying, Rabhira, dying of the plague!' This is the voice

"The March of Life."

RABHIRA was the only surviving son of his parents. His parents lived in the village Govara beautifully situated on the river Javana. They were poor and subsisted on a plot of land inherited from their ancestors. They had no other incentive to live in the world except for their young boy. Rabhira at the age of five was sent to a village 'guru' who himself knew only a little of his mother tongue. Within two years the boy had learnt all that he could teach. This encouraged the parents. They decided to leave for a city for his higher education. They sold their land and their small cottage for a small sum. Who could have paid more than what they got for the land in that village?

One morning the parents with their child said farewell to the village with tears. Arrived at the great city, Dinaba, the father, had a busy time—he had to find lodgings, he had to earn a living and above all put his son to school. Within a short time he managed cleverly enough the three things. He rented two small rooms in a remote corner of the city but near the school where the boy got admission. Rabhira was studious and the parents without a grudge, without a murmur catered for all his needs. They might retire at night starving and hungry but could never endure even the thought of their son lacking anything.

The years passed, Rabhira became the favourite of his teachers and the envy of his fellow-students. In him was the combination of industry and inspiration. He

acquired among those who have not had the same opportunities as you have. In all your future progress through life, whatever befalls you, remember that the honour and fair name of your University are in your keeping. See that the honour is never stained, that the name is never tarnished. In life, the academic degree you obtain today may or may not be of value to you, but the culture you have acquired and the character you have developed will go with you through life. It is not the certificate that will gain you the respect and confidence of your fellow-men, but it is by your conduct and character that you will secure them.

The Osmania University will shortly be celebrating its Silver Jubilee. May I conclude by wishing it a long successful career of service to the State and to the cause of civilization and progress.

SIR ARDESHIR RUSTOMJI DALAL,
Kt., I.C.S. (*Retd.*).

Industrial Trust Fund out of which industrial enterprise may be encouraged, is a wise and thoughtful measure on which I must tender my respectful congratulations to His Exalted Highness and his advisers. You have already helped in this way to start a number of industries in the State. In the Singareni Coalfields you have a valuable source of power and in the Nizam's State Railways you not only possess a good means of communication but also a large industrial undertaking which could well be the source of a number of engineering industries and the means of training engineers and technicians to staff them. From this point of view may I emphasize the need of devoting the utmost attention to the subject of mechanical and electrical engineering in your Engineering College, so as to equip your students as thoroughly as is done in any other university in India.

You have a large number of flourishing cottage industries, arts and crafts. I should very much like to see a system adopted on the Japanese model by which cottage industries could be integrated to the large industries, so that some of the components of a large industry may be made in the villages and assembled in central towns. For this purpose an extension of communication and of cheap electrical power to the villages would be necessary.

A last and very pleasant duty still remains before me, and that is to offer my congratulations to the Graduates of the year. You have obtained the hall-mark of the University, but may I remind you that you have made certain promises today to the Chancellor in open Convocation. You have promised to pursue truth, to cherish virtue and to disseminate the knowledge you have

* * * * * *

have altered since then, but the disproportion is still as glaring as ever. Even in the field of agriculture which is the primary industry of India, due to the lack of scientific methods and the poverty of the cultivator, the yield of the principal crops is appallingly low, as compared with the yield in other countries. The yield of rice is 0·39 ton per acre as compared with 1·01 in the U.S.A. and 1·61 in Japan; the yield of sugar-cane is 12·66 tons per acre as compared with 20·06 in the U.S.A., and 54·91 in Java; the yield of cotton is ·04 ton per acre as compared with ·11 in the U.S.A., and ·23 in Egypt. Even for an advanced country like Great Britain it was estimated before the war that the application of scientific methods and research could nearly double the produce of the land. Under the pressure of the economic blockade a great deal of progress has been made during the war in the application of scientific methods to British agriculture. If that is the position in a scientifically advanced country like Great Britain, imagine the scope for improvement in a country like India where scientific methods have barely been applied to agriculture in spite of the efforts of Government and of the Imperial Agricultural Research Institute, and where the yields are so poor. Here is a vast field for the student of scientific agriculture animated by a desire to improve the economic condition of the rural population.

You have a Department of Technical and Vocational Education, a Technical College, a College of Arts and Crafts and an Industrial Research Laboratory devoted to these ends. I was shown a building nearing completion which is to accommodate a Polytechnic Institute. All these developments show that you have the industrial development of the State prominently in your mind. The provision of the sum of one crore of rupees as an

Rightly or wrongly, for good or evil, this is the age of the machine and the history of the war has proved and is proving every day that it is only the scientifically developed countries which have highly organised industries which can hope to survive in the struggle for existence. The wonderful resistance of Russia which has evoked the admiration of the whole world has only been rendered possible through its extraordinary scientific and technological development since 1928.

The lesson for India is plain. It must embark upon an intensive programme of scientific and industrial development if it is to attain the position of a great independent country and to maintain it. It will be the duty and the privilege of the young scientists who are being trained in your University to help their country to achieve this position. There is a tremendous leeway to make up. India is primarily an agricultural country with sixty-seven per cent, of its population engaged in agriculture and a bare ten per cent, in industries. Though a certain amount of industrial development has taken place under the impetus of the war, it is small compared to the industrial development of countries like Canada and Australia since the war. The whole economy of a country which depends to such a preponderating extent on agriculture is unbalanced and unsound. Such a country can never achieve a high standard of living. It lacks the amenities of civilization enjoyed by advanced industrial countries and, what is more important, renders itself incapable of self-defence in modern warfare. The average annual income per head of population in India as estimated in 1931 is Rs. 65 as compared with Rs. 980 in the United Kingdom and Rs. 1,387 in the United States of America. The absolute figures of income may

There is no question on which more divergent opinions have been expressed by responsible men in the public life of the country than this—if, and to what extent, students while they are at the university should play an active part in politics. Speaking as one who is neither a politician nor an educationist but simply as one interested in the welfare and progress of the youth of our country, I would ask you to remember that the period of your stay at the university is one of preparation for life. When the preparation is ended and you have passed out of the university, it will not only be your right and privilege but also your duty to take an active part in all movements for the welfare and advancement of your country.

If in India today our political and social problems have become more difficult of solution, if the ugly spirit of communalism is eating into the vitals of our national life, I believe it is partly because the universities of India have in some measure failed to achieve their object of promoting culture, and dispelling not only ignorance but passion and prejudice. It is from the universities of the nation that we have a right to expect the promotion of feelings of toleration, mutual understanding and sympathy between the various elements that compose the national life. And it is from the young men who leave these universities that we may demand a sane and balanced judgment, a just sense of higher values, a broad mental outlook and a universal sympathy. But "if the salt have lost its savour, wherewith shall it be salted?" A university will ultimately be judged by its success or failure in enlarging and liberating the mind of its students and developing in them an outlook that transcends the narrow barriers of race, caste and creed.

* * * *

those who enter its portals to enrich those traditions and to foster those feelings of lovs and brotherhood among all communities.

* * * * * *

In pursuance of the aim of the founder to achieve a harmonious blend of ancient and modern culture, you are actively promoting studies and research in oriental languages, Sanskrit as well as Arabic. The Dairat-ul-Maarif which carries on the work of editing and publishing rare Arabic manuscripts has won international reputation for itself. It is this harmonious blend, this happy synthesis not only of ancient and modern culture but of Hindu and Muslim thought and spirit, the achievement of which should be the principal aim and crowning glory of your University.

Synthesis in the spheres of literature, philosophy and science has always formed the hall-mark of Islamic culture. On the one hand, we have a chain of venerable universities which have carried out this task through the ages, thus the University of Cordova combined the thought of Islam, of Spain and of Palestine. The El Azhar University of Cairo united the cultures of Egypt, Greece and Arabia. The famous Nizamia University of Baghdad had perhaps the largest number of students devoted to researches in Greek philosophy. Plato and Aristotle, Galen and Hippocrates were household words in Baghdad. The number of commentaries on Aristotle and Plato written by the alumni of the Nizamia could be counted by thousands.

In the words of a Persain poet:

چنین گفت دارا کہ دارش بسیست
ولیکن راگذسره با هر کسیت

* * * * * *

has rendered a unique service to the cause of education not only in his own State but throughout India, has affirmed in the charter founding the University that his purpose was "the inauguration of a University in the State in which the knowledge and culture of ancient and modern times may be blended so harmoniously as to remove the defects created by the present system of education and full advantage may be taken of all that is best in the ancient and modern systems of physical, intellectual and spiritual culture. In addition to its primary object to diffuse knowledge, it should aim at the moral training of students and give an impetus to research in all scientific subjects." The progress of the University since its foundation indicates that this purpose is being fulfilled.

* * * * * *

It redounds greatly to the credit and honour of your gracious sovereign that he transcended the narrow conception of a sectarian university and founded an institution which throws open its portals to all the youth of Hyderabad irrespective of caste or creed in accordance with the catholic ideals of a true university. This principle of toleration, this synthesis of cultures, is expressed even in the architecture of your stately buildings, which are the realisations in stone of the inspirations of your gifted architect, Nawab Zain Yar Jung Bahadur and of M. Jasper. The harmonious fusion of the Ajanta and the Moghul styles in the design of your buildings is a symbol and an object-lesson. It is a symbol of the mutual love and good-will of the two great communities, Hindus and Muslims, who compose the population of the State, and of the tradition of tolerance established and cherished by the Rulers of the Asaf Jahi dynasty. It is an object-lesson of permanent value to all

Convocation Address, 1942.

MAY I begin by expressing my keen appreciation of the great honour His Exalted Highness and the authorities of the University have done me by inviting me to deliver the Convocation Address this year. I do not claim to have made any special study of educational problems or to have achieved any such distinction in the realms of science, literature or politics as to entitle me to the compliment you have paid me.

In the Osmania University you set out to do, and have already succeeded in doing something that is unique in the educational annals of this country. Appreciating the defects inseparable from a system of education through the medium of a foreign language, such as the strain on the students' memory, the stifling of originality and the unbridgeable gulf created between the educated classes and the mass of the population, you have with a vision and a courage worthy of admiration, founded a University imparting education through the medium of Urdu. At the same time, through your Bureau of Translation with its large staff of highly qualified translators, you have succeeded in translating the greater part of the books embracing practically the whole range of university studies and have thus not only freed the students from the shackles of a foreign language but have contributed a great deal to the advancement of Urdu language and literature.

His Exalted Highness, whose name this University bears and who through the foundation of this University

the play-ground he plays with and for his team. In short, *mensa sana in corpore sano* should be literally accepted.

For all this, better economic organization is presupposed. Even if properly educated as children they would as adults be crippled and embittered by the desparate fight for jobs. Only under the aegis of economic security can the intellect bid for the fullest growth. If we could reform education along these lines and at the same time reform economic conditions, we might in a few years produce quite a new world, the envy of even the utopians. The task before educationalists is to use every art and propaganda and reasonable persuation to make all men see that the modern world cannot find peace and prosperity, still less true happiness, till all its citizens are educated in such a way as to call out their full capacity for citizenship and personality.

E. V. RAM REDDI, LL.B.,
(*Previous*).

handicaps, e.g., lack of public sympathy and Government encouragement. Over to 8,2000 have been made literate, including a large number of women. And this improvement must continue. The authorities, should make it a point that all illiterate prisoners shall be educated.

The Double Function of Education.

Education is its own end; still we can ill-afford to ignore its vocational side. The glamour of degrees has brought ruin to Indian students. They issue from the college portals, only to prove complete misfits in the practical world. India sorely needs industrialization. Her sons should be equipped with technical skill. Science is the trump card which is missing from our pack and we get it only on loan from the West. It is indeed a sorry spectacle to see more students in arts than in any other faculty. This state of things should go forthwith.

True education cannot be sacrificed to vocational training either. Literature which makes for accuracy and penetration of thought and delicacy of emotional reaction; Mathematics which whets the intellect, philosophy which supplies the true intellectual corrective to the more blinkered and dogmatic kind of science—can by no means be ignored. Nor can politics and economics be neglected. Biology should be the starting point of a sound curriculam.

Athletics, Debates and other Social Activities.

The value of debates and athletics cannot be exaggerated. On the platform the student unlearns the dread of the audience and learns to be relentlessly critical of his own motives and at the same time imaginatively sympathetic towards the motives of others. On

his teacher's aid and stimulus. He must attach no *a priori* rightness to the teachers' decisions. They are not infallible beings anymore than he is; they are, like himself, open to criticism, though on the whole more experienced and capable. Contradiction is the motive force of all progress.

Adult Education.

The problem of adult education is closely connected with the task of juvenile education. Early impressions being difficult to efface, the child should be preserved from an ignorant domestic environment. To imagine that education does not begin at home is foolish. Real education begins at home. At present most children are warped by early home influences, either by the strained relations between parents or by unwise treatment, some spoiled by undue repression. Many torn between love and hate for one parent or both, develop deep-seated complexes. As a result, most children grow up with unsuspected mental kinks, prejudices and phobias, which make it impossible for them to become satisfactory citizens. To prevent such untoward developments parents should be properly educated; in fact, no one should be allowed in the intelligent state to become a father or mother without a licence for parenthood.

Of late many adult education schemes have been proposed, most of them only to sink into oblivion. No pusillanimous attempt will effect any tangible changes. Sustained work alone can wipe out illiteracy and prevent further lapses into ignorance. The Bombay Educational Committee which launched its crusade against adult illiteracy four years ago, has done exemplary work; and this in the teeth of considerable

Teachers, their Status and Relations with Students.

Since the right type of education is necessary for progress, the whole educational system of a country should be more a source of pride than its apparatus of industry and agriculture. These produce only commodities for citizens; education produces the citizens themselves.

The Selection Board must be very fastitidious in the choice of teachers. Nepotism and favouritism are particularly out of place. Only persons of high mental calibre should be allowed to teach; and only those who have also a special uptitude for the profession. An adequate system of education requires a great host of young, vital and well-trained men and women to carry on the important work of evoking personality, organizing sentiment and imparting information in such a way as to stimulate intelligence.

Everything should be done to preserve the young from the influence of tired, and therefore fossilized brains. Teachers who have attained the age limit should be given posts in the Civil Service, where they will still be able to do good work without damaging any.

The teaching profession must be given as much autonomy as possible, since educators alone can appreciate the importance and difficulties of education. History-text books should be very strictly supervised by the international authority.

Not only this. If education is to proceed rightly the student must have the right kind of relation with his teachers. He must not be spoonfed, instead he must be made to feel that he is educating himself, though with

imagined. Under the existing system of education the student has to learn his dull lessons in a language with an entirely different genius. It is now accepted that the child should be instructed in all stages of his education in the language in which he learnt to lisp. But our educationalists are still conniving at this anomaly. English is still the medium of instruction in almost all the Universities of India. Although latterly it has lost favour, yet it retains its position as the medium of instruction. Here the Osmania University has done pioneer work. Whatever be its defects—and, one has to admit, there are many—, it has got one redeeming feature. It has taken the bull by the horns by introducing Urdu as the medium of instruction even in the higher stage. Recently on the occasion of its Silver Jubilee, Mahatma Gandhi took the Benares University to task, when he criticised its medium of instruction. The process of introducing vernaculars as the media of instruction and examination should, however, be slow and gradual.

Whether co-education makes for the healthier development of boys and girls is still a debated point. Its advocates say that since education is a preparation for life, co-education provides one of the best means of attaining that end. To train the sexes apart, they say, and then throw them together in society on the chance of their realizing harmonious co-operation, is at best a gambler's game. They maintain that the boys' standard of manners and courtesy is raised; the girls gain in freedom and width of outlook. However, after witnessing the appalling prevalence of divorce and other violations of the sacred bond of marriage in the West, which is largely due to co-education, we cannot but turn our back on this system and seek our salvation somewhere else.

action; to act, men need faith; to keep faith, men need reason; to direct all these, men need a vision of excellence. This vision of excellence cannot be cultivated except through education. As such all the children, boys and girls, rich and poor, should receive a certain measure of rudimentary education. At present children are herded into factories at the age of 13 and even earlier, when education has scarcely begun to attract them. Any capacity which they may have, is starved. No scheme which does not admit of compulsory primary education can meet the requirements of the hour. It doubtless makes a heavy demand on the country's resources. If Government cannot bear the burden of Compulsory Elementary Education, unofficial agencies should share the cost of it. However generous the government, unless public response is forthcoming, the aim is impossible of realization. The Government itself can stint no expenditure and spare no effort in the liquidation of illiteracy.

Certain Anomalies in Our Educational System.

At school and as college the students are not encouraged to develop their innate capacities and to use intelligence. Instead, they are trimmed into an approved their pattern, stuffed with information and trained to tender correct responses to the stimuli of patriotism and religion. Consequently they are reduced to robots. They are not taught to do any pioneer work in any branch of knowledge. Uunless this process is reversed, there is little hope of salvation.

Indian students are labouring under an additional handicap and its seriousness is now little questioned. It is the foreign medium of instruction. What untold harm it has done to the wretched Indians can only be

a sound educational policy, all the gains might be at once set off by the foolish educational system. What a puissant part education plays in the moulding of a people's mentality many be rightly gauged by Lenin's words,—'Give me four years to teach the children, and the seed I have sown will never be uprooted.'

We cannot, therefore, proceed with the building of the future world except in the perspective of the realization that much of the successor otherwise of our task will in a great measure depend on the type of the education which will replace the one that now obtains. As such the present sytem must go lock, stock and barrel. Education must be recast in method as well as content. Many a hoary idol of the market place has to be discarded. The new education will make for the growth of international sentiments so as to set against the recrudescence of national ambitions. The future citizens will be taught to look beyond patriotism. In the post-war world width of view will be the least sacrificed to intensity to gaze. Our *sin qua non* will be the eschewal of the things that disunite and the prizing of things that unite. But an only informed and effective will for reform can usher in the long-looked for era.

Universal Education

What is wrong with the world today is most emphatically not too much education, as some would suggest, but too little and that little too bad. In India and other backward countries where ignorance is still astride of the masses, the problem of universal education assumes serious proportions. Citizenship has been defined as the contribution of one's instructed judgment to the public good. Remember: to develop, men need

Educational Problems.

BLUE prints for a better and saner world are being pains-takingly devised by the United Nations The visions of a 'brave new world order' form the warp and woof of the their propaganda. Unfortunately, however, one of the weighty problems, nay in some respects the most important one, has hardly, if ever, come under the microscope for study. This indifferent attitude to the whole subject of education is highly regretable. One fails to see why any serious thought has not been bestowed on the educational problem. It must be noted that moral and aesthetic phenomena are not by-products of economic events, mere flotsam and jetsam cast upon the waves Has not this war which had its source in Germany been the logical consequence of its educational policy move them of anything else? Why is it that aggressive nationalism is so inextricably be implanted in the German Youth? We must chain this devil human civilisation is not to suffer shipwreak. Inaugurating a world broadcast on "The Reshaping of Man's Heritage," Mr. Wells said, "The supreme test before an awakening mind is the reeducating the world. Given world unity and of world sanity that would now be an easy task." The desire to make the diseased world healthier and nearer to the hart's desire of human kind is universal; but the correctives so far suggested do not touch the disease. There is an intimate connection between the right kind of education and a democratic order. However nice the blue prints might be, if they are not grounded on

nothing, and hence I am quite prepared to submit myself to the decision of this enlightened and cultured House (Cheers).

PRESIDENT:

Ladies and Gentlemen! The motion will now be put to vote. Those of you who are in favour of the subject will please hold up their hands (Counts the votes). Thanks.

Now those of you who are against the motion should please raise your hands (Counts the votes)...................

I feel a great pleasure in making the anouncement that the proposal has been defeated by an overwhelming majority (Loud cheers).

Now the meeting is dissolved.

MOHAMED BIN OMER, M.A.,
(*Osmania*).

But every member of the House would admit that this industry, inspite of all the unfriendly flings and vindictive remarks of the Hon'ble speakers, has become popular during the last few years. In this short period we cannot expect it to attain a very high standard of perfection to match Hollywood. This is neither reasonable nor even desirable. It is all the more surprising and creditable that under such circumstances, it has made tremendous progress, to command universal respect and applause. It has shown to us avenues of progress in every branch of life, and opened new channels of activity. It has introduced thoughts of equality, fraternity, righteousness and equity. It has painted every shape of character from a begger to a prince and from a fool to a sage. It is of no use for the Hon'ble speakers from the other side of the House, to hide their heads like ostrichs from these genuine facts (laughter) and think that none is observing them! If even now they are bent upon supporting the motion, then I can only say that reason is to them what pictures are to the blind and music to the deaf! (Laughter and Cheers).

PRESIDENT :

As no member of the House is coming forward, I call upon the Hon'ble Proposer to put up the rejoinder.

MR. NAIDU :

Mr. President, What I said in my speech in the beginning has not been disputed by any speaker from the side of the Opposition and whatever has been so blindly and illogically refuted by them, I am sure, I never alleged. Their objections were so absurd and contradictory that they automatically cancelled themselves out, leaving

PRESIDENT:

Order, Order, Order! (perfect silence).

.........The speaker may now continue his speech.

Mr. MURTI:

Sir, when we examine these so-called films, we find that most of them have the same plot, consisting of a chivalrous young man falling in love at first sight, with a conquettish maid. The monotany is here and there broken by villains, buffoons and tyrants. The actors and actresses sing many a time, in and out of season. There are films, Sir, in which heroes and heroines sing highly melodious and sweet songs while undergoing all the agonies and tortures of death (laughter).

These films instead of making us conscious of the present needs of the country make us luxurious and idle, and lead us into a fairy land of enchantments, superstitions and mysteries (cheers).

PRESIDENT:

Miss Sarojini will none oppose the Motion............ Miss Sarojini.

MISS SAROJINI:

Mr. President I breathed a sigh of relief when the Hon'ble speaker resumed his seat not because of the fact that he surpassed himself in the art of speaking............ without speaking at all on the subject but because of the fact that he knew nothing about the subject! (laughter).

He simply seemed to deliver an insipid homily......... like a doting priest, on the abuses of the Indian film Industry, without perhaps, having seen a single film in his whole life (laughter).

unworthy of a Mover of a debate, has made up his mind to deliver a fatal blow at this highly flourishing and purely indigenous industry (cries of "Shame).

Many Indian Film Companies, particularly, the New Theatres and Bombay Talkies have produced a number of films which along with genuine beauties of characterisation, plot, acting and representation of human life, have not a little helped in exposing the evils and weaknesses of Indian social life and delivering death blows at our degenerate habits, conventions and traditions. In short, Sir, these films have undoubtedly worked a great deal towards rural uplift, economic improvement, diffusion of knowledge, religious toleration and social reconstruction among the people of this country, in the most charming, delightful and commendable manner (cheers).

PRESIDENT:

Mr. Murti will now speak for the Proposition.........

Mr. Murti.

MR. MURTI:

Mr. President, I confess, I rather sat uneasily throughout the whole speech of the Hon'ble Leader of the Opposition, with feelings of misgiving about the soundness of his judgement and the sanity of his understandings! (laughter).

His whole speech was full of misstatements of fact, malignant remarks, perverted notions, and childish insinuations not worthy of the Hon'ble Leader of the Opposition!

(Prolonged cheers, cries of shame and some confusion).

has made a wonderful statement about the function of the Film Industry...............that it should make the masses educated, cultured and civilized. This is indeed a startling discovery and he should be awarded a......consolation prize for it! (laughter) I am afraid, Sir, the moment this Industry begins to perform such functions, all the theatres and cinema halls will be deserted........ of course with the solitary exception of my friend! The proper place for these functions is an educational institute or a cultural centre, where, incidentally, I wish to see the Hon'ble Proposer, when he may at least learn clever thinking, brevity of expression, sense of judgment and the art of debate! (cheers).

MR. NAIDU:

On a point of order, Sir! The Hon'ble Leader of the Opposition is making highly objectionable and irrelevant remarks.

MR. ASAF ALI:

Mr. President, my remarks have not been more objectionable and irrelevant than his own; and I am confident that no amount of interruption or interference in my speech, on his part, can deter me from exposing his his blunders and howlers (cries of "Hear, hear!).

My Hon'ble friend from the other side of the house, seems to possess no knowledge about the development of the Indian Film Industry during the last ten years. May I inform him, Sir, through you, that the Indian films have not only displaced Western Films in every part of the country ; but they have also won a number of prizes in foreign Film Exhibitions and Competitions But the tragedy is that my Hon'ble predecessor, with information

An analysis of the various Indian Films will reveal the fact that they excel each other not so much in the educational, social or economic improvement of the masses as in misrepresentation of facts, racial animosity, hatred of modern life, and appreciation of all that is brutal, lawless and unreal in nature. Instead of exposing our superstitions, decrying harmful conventions and traditions and condemning the evils of Indian society, they present scenes, characters and dialogues that are as remote from reason and commonsense as my friends from the other side of the House! (cheers).

Our Indian films often eulogise foolish miscreants, ruthless adventurers, cruel potentates, effeminate heroes with fictitious characteristics and manly heroines with imaginary attributes. The incidents and events of the story have nothing to do with dramatic propriety, nor does the development of the plot pay attention to dramatic unity.

Thus we see that these films not only fall short of the present needs of Indian society but they definitely fall short of reality and truth; human life and human character. (cheers).

PRESIDENT:

Mr. Asaf Ali will now lead the opposition..........

Mr. Asaf Ali.

MR. ASAF ALI:

Mr. President. The hon'ble speaker has committed such blunders in a few minutes that it will take me years to correct them, and now, I am convinced of the fact that more absurdities can be committed in a few minutes than can be got rid of in a lifetime! The Hon'ble Proposer

I am sure, Sir, that even the Hon'ble Leader of the Opposition cannot deny the fact that the Film Industry occupies a prominent place in the educational, social and political progress of the West, nor that this characteristic is conspicuous by its absence in the Indian Film Industry.

I do not know with what ulterior motives the Hon'ble Leader of the Opposition has accepted the responsibility of paying a tribute to this degenerate industry in presence of so many factors against it. It is perhaps due to his enormous capacity for self-deception..........which, however, seems to be his signal merit! It is perhaps due to that peculiar morbidity of mind which considers ignorance as bliss! But, Sir, neither self deception nor ignorance can hide the fact from the Hon'ble members of this enlightened House, that the most sacred duty of the Indian Film Industry is to educate the masses.....and most flagrantly it has been violating that sacred trust! (cries of Shame!) It should acquaint them with the history and greatness of the country, the industrial, economic and social needs of the people. It has so far done nothing of the kind. It should create moral and cultural values. But it has made the people more fashionable, extravagant, luxurious, and fond of all the follies presented on the silver screen.

There can be no nobler task for the Industry than to enhance the knowledge and learning of the people, and make them enlightened, cultured and civilised. When we consider the Indian Film Industry from this point of view, we are sorely disappointed......and yet the Hon'ble speakers from the other side of the House have pledged themselves to oppose the motion, against all the principles of sanity, justice and righteousness! (cries of Shame!).

A College Debate.

SUBJECT :—

That in the opinion of this House, The Indian Film Industry has failed to meet the present needs of the country.

SPEAKERS :—

1.	Proposer	... ...	Mr. Naidu.
2.	Opposer	... ...	Mr. Asaf Ali.
	For the motion	...	Mr. Vazir Hasan.
	Against the motion		Miss Sarojini.
5.	Rejoinder	... ...	Proposer.
6.	Conclusion	... ...	Mr. President.

THE PRESIDENT :

Ladies and Gentlemen, The subject for discussion is that in the opinion of this House "The Indian Film Industry has failed to meet the present needs of the country." It is indeed a very interesting subject, and I hope that the speakers will do full justice to it. Now I call upon Mr. Naidu, the Hon'ble Proposer, to place the subject before the House..............Mr. Naidu.

MR. NAIDU :

Mr. President, Sir, I have to propose that in the opinion of this House, The Indian Film Industry has failed to meet the present needs of the country.

what the weather was like in a long past August, and the name of the provincial hotel at which he had a vile meal during the summer.' Rose Macaulay writes wittily on Choosing a Religion: 'We are more interested in choosing a toothpaste than in choosing a religion,' she complains. After discussing various religions and sects, she concludes: 'I do not know, either, that you will gain much by being a Buddhist or a Confucian though these religions have their advantages. Some people are Theosophists, and have many successive lives; others are Mormons and have simultaneous wives; others are Pagans suckled in a creed outworn, and have many curious gods; others are Pantheists and worship in the Temple of Nature. It all depends on what you want. The choice is wide, and the only really dull thing is to have no religion at all.' Of topical interest is the way the essayist writes about war and peace: Hear Mr. Lynd: 'The world at peace was always beautiful in May and June, but it seems doubly beautiful when we gaze on fragments of it in a world at war. Never did the song of birds sound more restful in its sweetness............Yet even lovelier than the song of the bird is the courage one sees all about one—the courage of soldiers and the courage of those who love them and grieve to see them go.' And thinking of all the noble cities laid waste by the horrors of modern war, we may recall the words of Gardiner in writing about the ruins of Ypres, after the last war: 'One day it will rise from its ashes, its streets will resound once more with jest and laughter, its fires will be relit, and its chimneys will send forth the cheerful smoke. But its glory throughout all the ages will be the memory of the days when it stood a mound of ruins on the plain with its finger pointing in mute appeal to Heaven against the infamies of men.'

M. S. DORAISWAMI.

writing articles for a living, you will know that sometimes the difficulty is not writing the article, but choosing a subject. It is not that subjects are few; it is that they are so many. It is not poverty you suffer from, but an embarassment of riches.' So as the Walrus said to the Carpenter; the modern essayist begins to talk of many things,

> Of shoes — and ships — and sealing-wax —
> Of cabbages — and kings —
> And why the sea is boiling hot —
> And whether pigs have wings!

The essayist will talk of food and drink wisely and well, as for instance Mr. Milne on Lunch: 'An invitation to dinner is formal, to tea unnecessary, to breakfast impossible, but there is a casualness about invitations to lunch, very friendly and pleasant.' Or, of lunch in the train: 'The panorama flashes by outside, nearer and nearer comes the beautiful West; you cross rivers and hurry by little villages, you pass slowly and reverently through strange old towns....................inside, the waiter leaves the potatoes next to you, and slips away.' Mr. Belloc discusses Tea and concludes humorously: '*In vino veritas.... In aqua satietas........In........* What is the Latin for Tea? What? Is there no Latin word for Tea? Upon my soul, if I had known that, I would have left the vulgar stuff alone!' People complain of memory. Mr. Lynd is surprised at the things we remember: 'Modern man remembers even telephone numbers. He remembers the addresses of his friends. He remembers the dates of good vintages. He remembers appointments for lunch and dinner. His memory is crowded with the names of actors and actresses, cricketers, footballers and murderers. He can tell you

probably arises from our enjoyment of other people's mistakes. If we did not make mistakes, there would be nothing in the world to laugh at. Hence, if we regard laughter as a blessing, we should pay a tribute to error'! One of his volumes is entitled *The Pleasures of Ignorance.* He will write in defence of idleness exactly in the style and manner of Stevenson's Apology for Idlers. His latest volume of essays called *Life's Little Oddities* was published only in 1941. It shows him still the humorous and kindly observer of men and things. The essays are full of references to life in England today, and there are frequent allusions to war's alarums and excursions, to air-raids and sirens and rationing of meat. One essay is on Hess's Chicken and deals with the storm of public protest which followed the announcement that Herr Hess when he landed in Scotland was given roast chicken, while patriotic Englishmen and women starved and pinched. Mr. Lynd argues the case: 'The general theory seems to be' he says 'that you should not give a bad man chicken.........But a proverb tells us to give the devil his due.........Do not complain if he gets a little chicken. To do so is a waste of that excellent emotion, moral indignation.'

The modern essayist is concerned with life, with men and manners. He is a humorous commentator on life and often he brings in a good deal of philosophy and thought into the little sketch. The subject may be 'serious or trifling, about God and Spinoza, or about turtles and Cheapside.' 'Let us write essays on a stray cat or a coloured cloud' is the counsel of Chesterton. 'Let us talk about, well, anything, you will. Goldfish, for instance,' says A. A. Milne. Says A. G. Gardiner: 'I wanted a subject for an article. Now if you are accustomed to

Gardiner's work is notable for its quiet humour and humanity, its cheerfulness and his fine sense of style. He, too, shows a variety in subject and in treatment: He will write essays On Choosing a Name, On Catching the Train, On Talking to Oneself, On Umbrella Morals, (where he houmorously discusses the ethics of exchanging your umbrella for a better one in the hall-stand!) On Living Again with its fine philosphical conclusion: 'We are all glad to have come this way once. It is the thought of a second journey over the same ground that chills us and gives us pause......Yet if life is to be lived here again, it must be lived on the same unknown terms in order to be worth living. We must come as we came before, like wanderers out of eternity for the brief adventure of time.' What can be more fitting than the conclusion to his essay On Falling in Love: 'In short there is no formula for falling in love. Each one does it as the spirit moves.'

E. V. Lucas, editor and biographer of Lamb, has brought back the spirit of Elia into the modern essay. He is in many ways different from his hero; he lacks his wit and whimsicality, his quaintness and his archaism of thought and style. Yet his essays are marked by fancy and delicate sentiment, a light vein of humour and charm. Lucas has also given us a new and original type of writing, a blend of the novel and the essay in what he calls his 'entertainments' in books like *Over Bemerton's* and *Listener's Lure*.

Mr. Robert Lynd is among the most popular of modern essayists. His charm consists in his 'familiar, discursive and humorous style' and in his whimsicality derived and imitated from Charles Lamb. He will defend lost causes; he will argue in praise of mistakes, saying 'All comedy

'humorous dogmatic statement and the brilliant and effective use of paradox.' Here is an example: 'Most people either say that they agree with Bernard Shaw or that they do not understand him. I am the only person who understands him, and I do not agree with him.' His subjects are various. He writes on Pigs as Pets, On Running after One's Hat, On a Piece of Chalk, On Lying in Bed. In his volume *As I was Saying* there are essays About Poetry, About Blondes, and About Coleridge. A little group further down includes essays About Morris, About Widows and About Relativity!

This variety of subject-matter is the mark and characteristic of all modern essay literature. What shall we say of Hilaire Belloc whose successive collections of essays appeared under the titles *On*, *On Something, On Everything*, *On Anything* and even *On Nothing*. He defends the last title by saying that 'There is in Nothing some-thing so majestic and so high that it is a fascination and spell to regard it!' And this volume *On Nothing and Kindred Subjects* contains essays on Tea, On Railways and Things, On a Dog and a Man also, on Lords, On the National Debt, On Death and On Coming to an End.

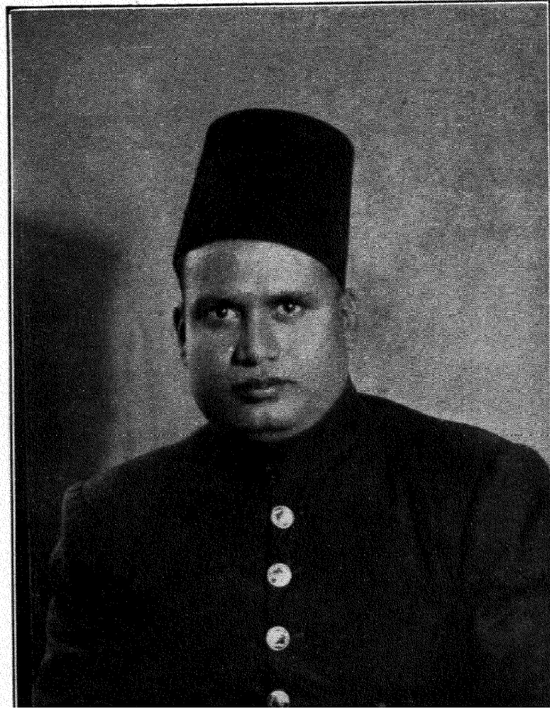
A. G. Gardiner made his mark by his sketches of his distinguished contemporaries in the Saturday Daily News. These were collected together in two volumes as *Prophets, Priests and Kings* and *Pillars of Society*. Later volumes of Mr. Gardiner contained essays which had originally appeared in the Star and were entitled *Alpha of the Plough*, (the pseudonym under which he wrote for many years), *Pebbles on the Shore* (a volume of essays written during the last war, 'pebbles gathered on the shore of a wild sea' as he calls them,) *Leaves in the Wind* etc.

In spite of all this, however, it seems likely that some of the work is such as 'the world will not willingly let die.' The list of great modern English essayists begins with Mr. Max Beerbohm and includes many of the most famous contemporary men of letters—G. K. Chesterton, Hilaire Belloc, H. G. Wells, A. G. Gardiner, E. V. Lucas, Robert Lynd, C. E. Montague and literary critics like Augustine Birrell, Austin Dobson, Edmund Gosse, Middleton Murry and J. B. Priestley.

Max Beerbohm produced in 1896 his first volume under the impressive title of *Works of Max Beerbohm* and in 1912 he wrote his inimitable parodies of his contemporaries like Shaw, Wells and Conrad in *A Christmas Garland*. His volume *And Even Now* contains his excellent sketch of Swinburne and Watts-Dunton in the essay, *No. 2 The Pines.* It was really Mr. Beerbohm who revived the essay of personal comment and intimate revelation, so characteristic of Charles Lamb's *Essays of Elia.* And in style as in subject, Beerbohm showed his originality and his charm. After Beerbohm, we might mention G. K. Chesterton, who, besides writing poems, plays, novels, short stories, history, biography and criticism, still produced 'copy' for the newspapers and periodicals and collected his essays in more than thirty volumes! The titles show their inconsequence : *As I was Saying, Generally Considered, Tremendous Trifles* etc. His essays are critical, descriptive or argumentative and it is in the last type of writing that he particularly excels. He declared that 'the gloomy pleasure of his life had been defence of orthodoxy and the pursuit of heretics.' In volume after volume he defends Catholicism and the glory and greatness of the Middle Ages. The two qualities of his style have been well defined as

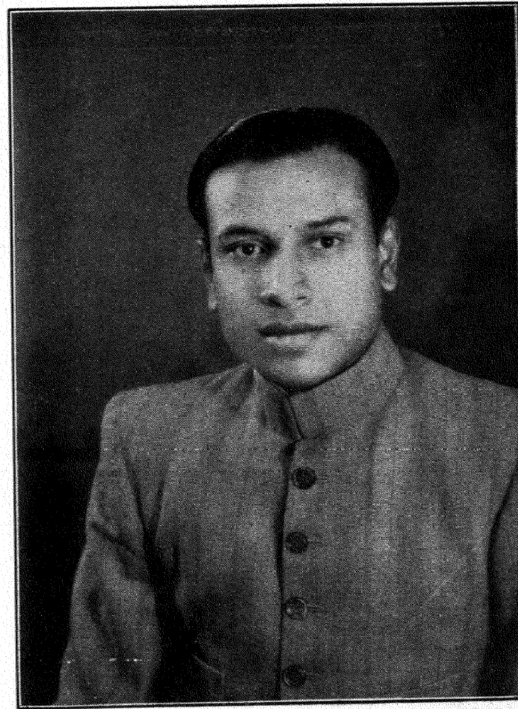
The Modern English Essay.

'ALWAYS the journalist writing for the day only,' was the comment of one of his biographers on Gilbert Keith Chesterton. The verdict may be passed on the whole group of writers of the essay in modern English; yet it would be unfair considering how much of their work is likely to endure. Of course it is not easy to write day after day, week after week, 'to write for busy people catching trams or trains in the morning or for tired people coming home in the evening' and still maintain a high quality of subject-matter and of style. Mr. Milne lets us engagingly into the secret of how much of the writing is done: 'Sometimes when the printer is waiting for an article which really should have been sent to him the day before, I sit at my desk and wonder if there is any possible subject in the whole world upon which I can possibly find anything to say.' Mr. Lynd has been writing the 'middle' article in the *New Statesman* for more than twenty years every week on the appointed day at the appointed hour, and the lot of other contemporary essayists has not been much better. Many have written for newspapers and periodicals and written regularly for years, not always because they were bursting with something to say but because 'they had to suck their sustenance through the quill.' Chesterton, in the preface to one of his volumes of essays collected from periodicals, says: 'It is a collection of crude and shapeless papers upon current or rather flying subjects......... They were written, as a rule, at the last moment; they were handed in the moment before it was too late.'



MR. KHAJA MOINUDDIN B. A. (OSMANIA).

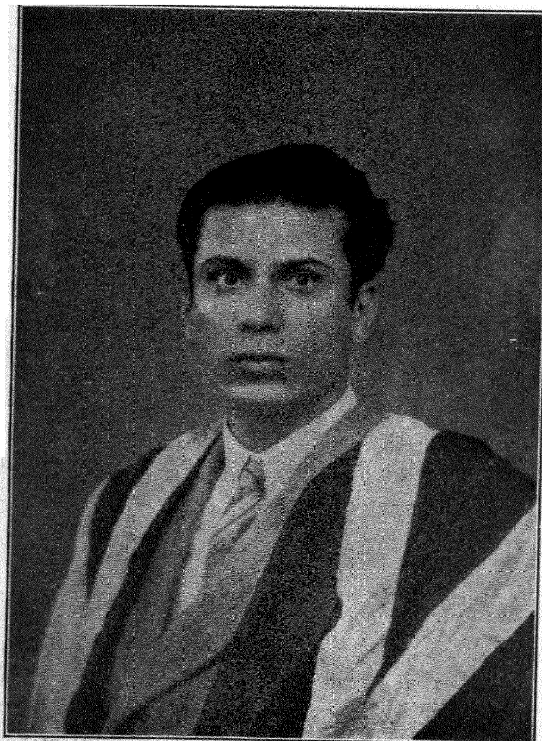
"He has written a number of books on international affairs. He has started an institution for coaching the candidates who wish to appear at H. C. S. competitive Examination. I understand that this institution has achieved good success under his direction". Says our P. V C. about him.



MR. MAHMOOD ALI KUTBI,

B. A. LL. B. (OSMANIA).

He is one of the most brilliant students of our University. He has obtained the highest marks amongst the first class candidates of LL. B. this year.



MR. QAZI AHMED KABEERUDDIN,
B. A. (OSMANIA).

He is a prominent student of our University. Now he has been selected as Civil Gazetted Officer on His Majesty's Ordnance Services.



MR. SYED MOHAMED ALI,
B. A. (OSMANIA).

He is an all-round Sportsman and first class athlete, won the Inter college and Inter Faculty Sports championship respectively this year. He is also captain of the Athletic Sports Club.

Editorial

WITH this issue, our Magazine nears the completion of the sixteenth year of its life.

We received with joy and pride an unprecedented number of articles for the second issue this year and offer our hearty thanks to our contributors for their keen interest in the Magazine, but as the number of the articles received was far more than what we could include, many of them have had to be withheld for sheer want of space. We request our contributors to wait patiently till the next issue, when some of them may see themselves in all the glory of print.

We deliberately refrain from comments on the articles published, lest we should be accused of the proverbial vanity and self-conceit of literary critics; therefore we leave the task of evaluating the merits and demerits, should there be any, of the articles to the critical faculty of the readers themselves.

For long, a rather unhappy feature of our Magazine has been the scarcity of contributions from the Zenana College despite several reminders. That there is no dearth of talent in the Women's College has been amply demonstrated by examination results. We are, hence, at a loss to understand the silence of the lady students, but we hope we will have, now, no occasion to repeat this complaint.

SAEED AHMED MEENAI,
M.A., (*Previous*).

Contents

The Osmania Magazine

Vol. XVI. No. 2.

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.

Managing Editor:

MOHAMED ALI NAYYER, M.A. (Final).

Editor:

K. R. REDDY, M.A.

(Final)

Asst. Editor:

SAEED AHMED MEENAI, M.A.

(Previous)

Vol. XVI. 1943 No. 2.